سمیرا اعجاز

اُردو رسم الخط کے مسائل

Problems of Urdu Script

Abstract:

Sumaira Eijaz, Lecturer, Urdu Department, Sargodha University, Sargodha.

The edifice of a language is erected on blanaced script. Urdu script is very rich and absorbing in its nature. It is admixture of many languages and dialects. Now its absorbity has made its face misty and there is the need to emerge its own identity and features. Although the advancement in language is an automatic process and it is always being trimmed off. Now some measures must be taken for its life.

مائع مواد اپنی نہاد میں تب تک صورت گری کا متحمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُسے کسی ظرف میں اُنڈیلا نہ جائے۔ اب ظرف کی شکل اور جسامت پر ہی اُس مائع کی شکل متعین ہوتی ہے۔ زبان بھی ایک ایسا ہی مائع ہے جسے اپنے نقوش کی عکس گری کے لیے ''رسم الخط'' کی ضرورت ہوتی ہے۔

رسم الخط درحقیقت وہ سانچا ہے جس میں خیالات کو سمویا جاتا ہے۔ زبان نفس ہے تو رسم الخط قالب۔ رسم الخط اور زبان کا تعلق جسم اور روح کے تعلق کے مترادف ہے۔ رشید حسن خان کہتے ہیں:

> ''املا دراصل لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے اور جو طریقہ ان حرفوں کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہ رسم الخط کہلاتا ہے۔'' ۱

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

> ''رسم الخط سے مراد وہ نقوش و علامات ہیں جنھیں حروف کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ہوتی ہے۔'' ۲

رسم الخط، کسی بھی زبان کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جیسا کہ ہم غاروں سے زیادہ دل کش عمارت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہر زبان اپنے مخصوص پس منظر کے پیش منظر میں اپنا ہیولا تخلیق کرتی ہے۔ کوئی بھی زبان خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس کے اظہار کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں جو اُس کے لسانی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ایک زبان کے مطالب کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں من وعن ظاہر نہیں کیے جاسکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر زبان کے لیے جداگانہ رسم الخط کی ضرورت نہ ہوتی اور ہر زبان ایک ہی قسم کے حروف یا رسم الخط سے کام چلالیتی۔ مثلاً اگر اس لفظ کو اُردو میں سمونے کی کوشش کریں تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں جو پے چیدگی اور اُلجھن پیدا کرتی ہیں:

"Al Baqi"

اِس کو "الباقی" بھی پڑھا جاسکتا ہے اور "البقیع" بھی۔ اِسی طرح درج ذیل الفاظ کو اُردو رسم الخط میں سمونے سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے:

Birth	Berth
برتھ	برتھ
Die	Dye
ڈائی	ڈائی
Far	For
فار	فار

ہر زبان کے سانچے مختلف ہوتے ہیں کیوں کہ زبان انسانوں نے اپنی ضروریات اور جذبات کی ترسیل کے لیے وضع کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان کا دامن ہمہ وقت انجذاب کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی تہہ میں بھانت بھانت کے موتی ملفوف ہیں۔ عربی ہو یا فارسی، سنسکرت ہو یا ہندی، انگریزی ہو یا ترکی وچینی، ہر زبان کے لیے اس کی آغوش، وا نظر آتی ہے۔ چناں چہ ایسی زبان کے لیے اظہار کا پیرایہ بہت عرق ریزی کا طلب گار ہوتا ہے۔ اُردو زبان کا رسم الخط اپنی نہاد میں اتنی قوت وتوانائی رکھتا ہے کہ بدیسی لفظوں کو بھی اپنا حصّہ بنا کر ظاہر کرسکے۔ سیّد محمد سلیم، اُردو رسم الخط پر تبصرہ کرتے ہیں:

"جس طرح اُردو، زبان کا دل ہے اُسی طرح اُردو زبان کا رسم الخط بھی جامع رسم الخط ہے۔ کوئی دوسرا رسم الخط جامعیت میں اُردو خط کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔" ۳

اُردو خط، عربی سے ماخوذ ہے۔ اس لیے عربی کا ہر لفظ آسانی سے اُردو رسم الخط میں سمویا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس اُردو رسم الخط میں بعض ایسے حروف ہیں جن کے حوالے سے عربی رسم الخط کا دامن تہی ہے۔

فارسی رسم الخط کے تمام حروف، اُردو رسم الخط میں موجود ہیں۔ اس طرح فارسی الفاظ کو بھی اُردو رسم الخط کے لبادے میں آراستہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اُردو کے چند الفاظ کا انجذاب ناممکن ہے۔

عربی زبان سے درآنے والے حروف ہندی رسم الخط میں موجود نہیں ہیں، لیکن اُردو رسم الخط میں موجود ہونے کے باعث اُنھیں ہندی رسم الخط میں سمویا نہیں جاسکتا۔ اُردو رسم الخط سے واقفیت رکھنے والا عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کو اُن کے حقیقی تلفظ کے ساتھ بول سکتا ہے۔ اُردو رسم الخط میں جامعیت و ہمہ گیری پوری طرح موجود ہے۔ دوسری زبانوں سے الفاظ قبول کرنے میں اس نے کبھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا، مخصوص حروف اختیار کرنے میں کبھی زحمت کا اظہار نہیں کیا۔ اس لیے جامعیت میں اُردو رسم الخط بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

رسم الخط زبان کا امین ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات یہی امین، خائن بن جاتا ہے اور پورا نظام تلپٹ ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کہتے ہیں:

"رسم الخط ایک ایسا جامہ ہے جسے انسان نے زبان کے قد پر حتی الامکان صحت، درست اور موزوں قطع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود یہ لباس کسی نہ کسی جگہ جھول جاتا ہے یا کس جگہ پر کس جاتا ہے دنیا کا کوئی رسم الخط اتنا مکمل، جامع اور وسیع الذیل نہیں ہے کہ وہ مختلف زبانوں کی آوازوں کو صحت کے ساتھ محفوظ کرسکے۔" ۴

اُردو رسم الخط جہاں اپنی نہاد میں قطعیت اور جامعیت رکھتا ہے وہیں اس میں چند نقائص بھی موجود ہیں۔ جس کی بڑی وجہ اُردو کا مزاج ہے۔ اُردو نے ادلتے بدلتے اور زمانے کی دست بُرد کا سامنا کرتے ہوئے اپنی صورت گری کی ہے۔ مختلف زبانوں سے اخذ و فائدہ نے جہاں اُس کے دامن کو وسعت بخشی ہے وہیں اس میں چند پے چیدگیاں بھی در آئی ہیں لیکن یہ رخنے ہر زبان میں موجود ہیں، جن کی نوعیت اتصالی بھی ہوسکتی ہے اور صوتی بھی۔

اتصالی مشکالات، واتصال حروف، شوشوں، مرکز اور اعراب وغیرہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ صوتی مشکلات مشتبہ الصوت حروف اور الفاظ سے متعلق ہیں۔

اُردو رسم الخط صوتی (Phonetic) بنیادوں پر ترتیب نہیں دیا گیا۔ اس میں صوت کی بجائے حروف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا املائی نظام ہماری اصوات سے بعید ہے۔

اُردو رسم الخط میں ہم صوت حروف دُشواری پیدا کرتے ہیں۔ حروفِ تہجی میں بہت سے حروف ایک جیسی آوازیں پیدا کرتے ہیں لیکن ان کی اشکال مختلف ہیں۔ مثلاً درج ذیل گروہ، مشترک صورت کے حامل ہیں:

۱۔ ا ع ء

۲۔ ت ط

۳۔ ذ ز ژ ض ظ

۴۔ ح ہ

۵۔ س ص ث

ایک مبتدی کے لیے ان میں سے صحیح حرف کا انتخاب دشوار ہوجاتا ہے اور اُس کے ذہن میں بہت سے سوالات گردش کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ سیب اور صابن

ان دونوں الفاظ میں آواز تو س کی ظاہر ہوتی ہے لیکن حروف مختلف کیوں ہیں سیب میں 'ص' جب کہ صابن میں 'س' استعمال کیوں نہیں ہوسکتا؟

۲۔ سالم ثابت

۳۔ تالاب طالب

۴۔ ذرا زندگی ظاہر ضد

ایک مبتدی کے لیے س اور ث، ت اور ط، ذ، ز، ظ اور ض میں سے صحیح لفظ منتخب کرنا بہت مشکل ہے۔ قومی تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۹ء میں اُردو رسم الخط کے نقائص بیان کرتے ہوئے لکھا:

"There are a number of letters which represent approximately the same sound as pronounced in Urdu. but are written differently.[۲]

اصوات، دو طرح کی ہوتی ہیں۔ سُر (Vowels) اور اسُر (Consonent)۔ اُردو رسم الخط میں حروفِ علت کے لیے کوئی نظام وضع نہیں کیا گیا۔ حروف علت کو ہم الفاظ میں ڈھال کر جب جملے کا حصہ بناتے ہیں تو یہ اپنی تحریری صورت میں تو ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن صوتی حوالے سے خاموش رہتے ہیں اور کسی قسم کا صوتی اظہار نہیں کرتے۔ مثلاً ذیل میں چند الفاظ کی تحریری اور صوتی صورت ملاحظہ ہو:

تحریری صورت	صوتی اظہار
خود	خُد
خواہش	خاہش
خواب	خاب

ان تمام الفاظ میں 'و' تحریر صورت میں تو ظاہر ہوا ہے لیکن صوتی اعتبار سے خاموش ہے۔ اسی طرح حروف صحیح کے حوالے سے بھی بے چیدگیاں موجود ہیں۔ حروفِ صحیح کے صوتی اور املائی اظہار میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ہم حروف صحیح لکھتے تو نہیں لیکن بولتے ہیں مثلاً:

املائی اظہار	صوتی اظہار
عنبر	امبر
انبیا	امبیا

اس کے برعکس صورت بھی نظر آتی ہے۔ ہم حروف صحیح لکھتے تو ضرور ہیں لیکن بولتے نہیں۔ ایسے حروف کو شمسی حروف کہا جاتا ہے۔ مثلاً الشمس اور عبدالرشید میں ل کی آواز ساکت ہے۔

اردو حروفِ تہجی کی ترتیب، صوتی اعتبار سے نہیں کی گئی بلکہ حرفی اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین نے اُردو حروفِ تہجی کی صوتیاتی ترتیب قائم کی جو درج ذیل ہے:

''ک	چ	ٹ	ت	پ
کھ	چھ	ٹھ	تھ	پھ
گ	ج	ڈ	د	ب
گھ	جھ	ڈھ	دھ	بھ
خ	س	ن	م	
غ	ژ	ش	ف	

ژ ر ز

ژ ھ

ق

ی ل ؤ"

دُنیا کا کوئی بھی رسم الخط ہماری تمام اصوات کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ یہ خامی محض اُردو رسم الخط سے مخصوص نہیں۔

اُردو کے املائی نظام میں بہت سے رخنے موجود ہیں اور یہ رخنے مناسب توجہ نہ ہونے کے باعث عجیب صورت اختیار کر گئے ہیں۔ جس سے اُردو کا املائی نظام انتشار کا شکار ہوگیا ہے۔ املائی نظام کو آسان بنانے کی دُھن نے اسے مزید بھول بھلیاں بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک لفظ کئی کئی صورتوں سے لکھنے کا رواج ہوگیا ہے۔ مثلاً ذیل کے الفاظ مختلف انداز سے تحریر میں نظر آتے ہیں:

اُنھیں اُنہیں

جنھیں جنہیں

مسالہ مسالا مصالحہ مصالہ

جز جزو جُز

کیجیے کیجئے کیجے

ان الفاظ سے اُردو املا میں افراتفری کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اِملا کی اس صورت حال کے در پردہ چند ایسی رکاوٹیں موجود ہیں جو ان مسائل اور انتشار کو جنم دیتی ہیں۔ اُردو رسم الخط میں حروفِ تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہ بات جہاں اس رسم الخط کی آغوشِ ذرخیز کو ظاہر کرتی ہے وہیں ایک مبتدی کے لیے اُلجھن کا بھی باعث بنتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس حوالے سے کہتے ہیں:

> "اگر آوازوں کی یہ کثرت اُردو رسم الخط میں نہ ہوتی تو اس کا مزاج وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ ایسی صورت میں آواز یا حروف کی کثرت کو اس کا عیب نہیں بلکہ ہُنر کہنا چاہیے۔ اسی ہُنر کی بدولت تو اسے قبولِ عام نصیب ہے اگر اس میں یہ ہُنر نہ ہوتا تو وہ اب تک زندہ نہ رہتی، کب کی مرگئی ہوتی۔" ۷

اُردو رسم الخط میں حروف کی اشکال متشابہ ہیں۔ ملتی جلتی اشکال ایک مُبتدی کے لیے مشکل پیدا کرتی ہیں۔ محض نقاط کے فرق سے حرف اور صوت بدل جاتی ہے۔ مثلاً:

ب	پ	ت	ٹ	ث
ج	چ	ح	خ	
د	ڈ	ذ		
ر	ڑ	ز	ژ	
س	ش			
ص	ض			
ط	ظ			
ع	غ			
ک	گ			

متشابہ اشکال کے باعث ایک مبتدی کے لیے ان حروف کی پہچان مشکل ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر آئینے کا دوسرا رُخ دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ پندرہ اشکال بنیادی ہیں اگر ان اشکال کو ازبر کرلیا جائے تو باقی حروف سیکھنے میں چنداں مشکل نہیں ہوتی۔

اُردو رسم الخط میں نقطوں کا التزام موجود ہے۔ تحریر میں اگر ان کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو نہایت درجے کا التباس پیدا ہوجاتا ہے۔ لفظ کی صورت اور معنی کہیں دُھند میں کھو جاتے ہیں۔ اُردو رسم الخط میں ایک رکاوٹ یہ ہے کہ حروفِ تہجی، تحریر میں کئی شکلیں اختیار کرتے ہیں اور دورانِ تحریر طرح طرح کی تبدیلیوں کا موجب بنتے ہیں۔ ایک حرف کے دوسرے حرف سے ملنے کے اس عمل کو ترکیب کہتے ہیں۔ انھی اُصولوں کے تحت حرف اپنی شکل لفظوں میں بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً درج ذیل لفظوں میں حروف کی بدلتی اشکال کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ''ب'' کی بدلتی اشکال:

طبیب رباب

اسی طرح ''س'' کی بدلتی اشکال:

لباس سامان

حروف بعض مقامات پر اپنی پوری شکل ظاہر کرتے ہیں تو کہیں آدھی۔ ایک مبتدی کے لیے یہ امر دشوار ہوتا ہے۔ اُردو رسم الخط کا ایک بہت بڑا مسئلہ اعراب کا ہے۔ زبان

میں اعراب سے مراد وہ علامتیں ہیں جو کسی حرف کی حرکت کو ظاہر کرنے اور تلفظ متعین کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ حروف میں اگر ان کا اہتمام نہ کیا جائے تو مفہوم میں پے چیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

عِلم	علَم
اِس	اُس
اِن	اُن وغیرہ

اُردو رسم الخط میں عمومی طور پر ان اعراب کا استعمال نہیں کیا جاتا، جس کے باعث پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ قومی تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۹ء میں اس نقص کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

> "Urdu script does not nomrally use the dicritical marks, with the result that a word as written or printed can be pronounced in several different ways." [۸]

اگر ان اعراب کا اہتمام کر بھی لیا جائے تو تب بھی ہمارا نظام اعراب ہماری تمام اصوات کی نمائندگی نہیں کرتا۔ مثلاً درج ذیل الفاظ کے درمیان فرق واضح کرنا دشوار ہے۔

بَیل	بیل	بِیل
مَیل	میل	مِیل

ان الفاظ کی ادائیگی اعراب صحیح طور پر نہیں کر پاتے۔ اُردو زبان نے جیسے ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنا چہرہ نکھارا ہے۔ اُسی طرح رسم الخط نے بھی مختلف مراحل سے گزر کر اپنی صورت گری کی ہے۔ ماضی میں جب اعراب کا نظام رائج نہ تھا تو اعراب بالحروف کا التزام کیا جاتا تھا، یہ التزام کسی سلجھن کی بجائے اُلجھن کا پیش خیمہ بنا۔ چناں چہ قدیم کتب کی قرأت میں یہ مشکل در آتی ہے۔ 'اوس' بمعنی اُس اور 'اوس' بمعنی شبنم میں امتیاز کرنا محال ہے۔

رموز و اوقاف ، اُردو رسم الخط میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی عبارت میں بہت اہمیت ہے اور اگر ان کا اہتمام نہ کیا جائے تو نتیجہ نا قابلِ بیان ہوتا ہے۔ اسی طرح اُردو رسم الخط میں الفاظ کو پیوست کر کے لکھنے کا چلن عام ہے۔ الفاظ کو ملا کر لکھنا، املا میں التباس پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:

علی قلی خان	علیقلیخان

اُردو رسم الخط کو سب سے زیادہ نقصان خط شکستہ یا گھسیٹ کی وجہ سے پہنچا۔ جہاں یائے معروف و مجہول میں کوئی فرق روا نہ رکھا جاتا تھا۔ فرق روا نہ رکھنے سے نتائج بالکل متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایسی صورت میں پہلا جملہ آسانی سے دوسرے جملے کا معنی اختیار کر سکتا ہے۔ مثلاً:

ستایش کے کسی تاب رقم ہی
اس کی اصل شکل اس طرح ہے
ستایش کی کسے تاب رقم ہے۔

اُردو رسم الخط میں الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں اختلاف پایا جاتا ہے، جو ایک مبتدی کے لیے اُلجھن کا باعث ہو سکتا ہے۔ مثلاً دل فریب کا لغوی مفہوم 'دل کو دھوکا دینے والا ہے' جب کہ اصطلاحی مفہوم 'بہت خوب صورت' ہوتا ہے۔ اسی طرح دل آویز کا لغوی مفہوم 'دل کو لٹا دینے والا ہے' جب کہ اس کا اصطلاحی مفہوم، بہت خوب صورت ہوتا ہے۔

اُردو رسم الخط میں چوں کہ حروف الفاظ میں شامل ہو کر اپنی شکل یکساں نہیں رکھتے، اور شوشوں یا چھوٹی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے ان شوشوں میں بد نظمی یا بے ترتیبی الفاظ کی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دُنیا کے کسی بھی رسم الخط کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ املائی نظام لچھوں کو بے معنی کر دیتا ہے۔ اُردو رسم الخط میں بھی یہ خامی موجود ہے۔ ہم غصّے، خوشی، نفرت، حسد اور رقابت جیسے جذبات کو رسم الخط میں نہیں سمو پاتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم الفاظ یا جملوں کے ساتھ قوسین میں لہجے ظاہر کرتے ہیں، مثلاً اُس نے میری طرف (ہنستے ہوئے) دیکھا۔

اُردو رسم الخط میں الفاظ کی ادائیگی یا تلفظ کا معاملہ بھی پے چیدگی کا شکار ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ املا تو مختلف ہے لیکن تلفظ ایک ہی اُصول پر مبنی ہے۔ ہم 'سچا' کا املا 'بچہ' یا بچہ کے تلفظ پر ان الفاظ کو ادا کیوں نہیں کرتے؟ اگر چہ، چناں چہ مثلاً کو ادا کیوں نہیں کرتے؟

اُردو کے املائی نظام میں ان پے چیدگیوں کے پیش نظر یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ رسم الخط کے حوالے سے اُردو زبان کا دامن کوتاہ ہے کیوں کہ یہ معاملہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے ساتھ چلتا آ رہا ہے اس طرح کے رخنے قریب قریب ہر زبان میں موجود ہیں۔ عبدالقدوس ہاشمی کہتے ہیں:

"کسی زبان کا رسم الخط کبھی اتنا مکمل نہیں ہوسکتا جتنا کہ کوئی مفکر سوچ سکتا ہے۔ اپنے رسم الخط کے ناقص ہونے کی شکایت دنیا کی ہر زبان کو ہے، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کا ہر رسم الخط ناقص ہے۔ بلکہ اُردو رسم الخط کی نسبت ناقص تر ہے"۔ ۹

رسم الخط کے اُن رخنوں کو جن کی بناء پر انتشار اور اختلاف کی صورت شدت اختیار کر گئی ہے، دور کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اپنی قومی زبان کے رسم الخط کو صوتیات Phonctics سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ مشترکہ آوازوں کا مسئلہ التباس پیدا کرتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر طارق عزیز کہتے ہیں:

"معترضین کے خیال میں ہم آواز حروف کے ان پانچ قبائل میں سے اگر ایک ایک حرف رکھ لیا جائے اور باقی خارج کر دیے جائیں تو حروف تہجی میں آٹھ حروف کی کمی ہو جاتی ہے۔ جب کہ رسم الخط کی صوتی استعداد پر کوئی اثر نہیں پڑتا"۔ ۱۰

اُردو رسم الخط کے ضمن میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا رہا ہے کہ اسے بائیں سے دائیں کی بجائے دائیں سے بائیں تحریر کیا جاتا ہے جس میں زیادہ توانائی صرف ہوتی ہے۔ اُردو رسم الخط کا تعلق عربی اور فارسی سے ہے اسی لیے یہ دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے۔ محمد حسن عسکری اس اعتراض کے حوالے سے جواب اس طرح دیتے ہیں:

"ہم لوگوں نے عام طور سے یہ بات نظر انداز کر رکھی ہے کہ ہمارے رسم الخط کا رُخ بھی وہی ہے جو طواف کعبہ کا رُخ کرتے ہوئے حاجی مرکز یعنی کہ بائیں ہاتھ رکھتے ہیں اور دائیں سے بائیں کو چلتے ہیں۔ ہندو اپنے طواف میں مرکز کو دائیں ہاتھ رکھتے ہیں اور بائیں سے دائیں کو چلتے ہیں۔ جیسے سنسکرت رسم الخط ہوتا ہے۔۔۔ یعنی طواف کی جو رسم چند حاجی سال میں ایک بار کرتے ہیں وہ ہر پڑھا لکھا مسلمان رسم الخط کے ذریعے ہر روز ادا کرتا ہے۔ اگر طواف کی کوئی دینی اور روحانی معنویت ہے تو یہ فیض رسم الخط ہمیں ہر روز پہنچاتا ہے۔ اور حقیقت کعبہ ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔" ۱۱

جب لفظ اپنی زبان سے کسی ایسی دوسری زبان میں پہنچ جاتا ہے جس میں اس کی بعض آوازیں نہیں ملتیں اس وقت بولنے والا اس دخیل لفظ کی آواز کو اپنی بعض ملتی جلتی آوازوں سے ادا کرنے لگتا ہے۔ اس طرح لفظ کا تلفظ بگڑ جاتا ہے۔ تلفظ کے لیے ارکان میں تقسیم کا طریقہ اپنایا جاتا ہے لیکن اُردو رسم الخط تقسیم ارکان کے اعتبار سے ناقص ہے اور اس کا پڑھنا اس لحاظ سے دشوار ہے۔

مسکرانا = مسک+را+نا

کھوپڑی = کھو+پڑی

کھوپ+ڑی

تلفظ میں صحت قائم کرنے کے لیے ایسا انداز اپنانا ضروری ہے جس سے ارکان کی تقسیم کے ذریعے آسانی سے صحیح تلفظ تک پہنچا جا سکے۔

اُردو کے املائی نظام میں چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لفظوں کو ملا کر لکھنے سے اُلجھن پیدا ہوتی ہے حتی الوسع لفظوں کو الگ الگ لکھنا چاہیے۔ خصوصاً مرکبات کو ملا کر نہیں لکھنا چاہیے۔ وہ الفاظ جو انگریزی یا یورپی ہیں ان دخیل الفاظ کو الگ الگ لکھنا چاہیے۔ مثلاً 'کاپی رائٹ'، 'پبلی کیشنز'، 'انسٹی ٹیوٹ'، سائکٹی فک وغیرہ۔ اِسی گروہ سے تعلق رکھنے والے چند الفاظ ایسے بھی ہیں جن کو ملا کر ہی لکھا جاتا ہے۔ مثلاً کانفرنس، اورینٹل، میونسپلٹی، پارلیمنٹ وغیرہ۔

عربی کے دخیل الفاظ جن کے آخر میں الف کی آواز ہوتی ہے مگر وہاں الف کے بجائے ''ی'' اور ''واؤ'' لکھی جاتی ہے اور اس پر چھوٹا الف (الف مقصورہ) نشان کے طور پر بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے ادنیٰ، اعلیٰ وغیرہ ان الفاظ کا املا اس طرح مناسب ہوگا۔ ادنا، اعلا۔ کئی الفاظ اُردو میں پورے الف سے رائج ہیں۔ مثلاً: تماشا، تقاضا، رہا، وغیرہ۔ چند الفاظ ایسے بھی ہیں جن کو ''ی'' اور ''الف'' مقصورہ کے ساتھ لکھنا ہی مناسب ہے مثلاً: موسیٰ، عیسیٰ، تعالیٰ، سدرۃ المنتہیٰ، مجتبیٰ، تقویٰ، شوریٰ وغیرہ۔

عربی اور ترکی کے کچھ الفاظ (ان میں انگریزی، ہندی اور یورپی زبانوں کے الفاظ بھی ہیں) ''ہ'' سے نہیں بلکہ ''الف'' سے لکھنا درست ہے۔ مثلاً ملغوبا، قورما، سانچا، ڈراما، دھماکا، تماشا، کچھ الفاظ اس اُصول سے مستثنیٰ بھی ہیں۔ مثلاً: بارہ، مہینہ، سموسہ، تولہ، پسینہ، ماشا، تکیہ وغیرہ اسمائے معرفہ کو اس طرح سے لکھا جائے۔

افریقہ، مرہٹہ، کلکتہ، آگرہ، بنگلہ دیش، امریکہ، پٹنہ، ہزارہ وغیرہ۔

''ہمزہ'' اور ''ی'' کا قضیہ اس صورت میں حل ہوتا ہے کہ الفاظ کو اس طرح سے لکھا جائے۔ 'لئے' کی بجائے 'لیے' لکھنے کے بجائے 'لکھیے'، دیئے کے بجائے 'دیے' کیجئے کے بجائے 'کیجیے' وغیرہ۔

اضافت کے اُصول میں لفظ کے آخری حرف کے نیچے زیر آتا ہے لیکن جن لفظوں کے آخر میں یائے ساکن ہوتی ہے اضافت کی صورت میں اس 'یے' کے نیچے زیر آئے گا نہ کہ ہمزہ۔ جیسا کہ ''مرضیٔ خدا'' کی بجائے ''مرضیِ خدا'' اور ''آزادیٔ وطن'' کی بجائے آزادیِ وطن''۔

عربی جمع اور مصادر کے آخر میں ہمزہ آتا ہے لیکن اُردو میں ان کے آخر میں ہمزہ نہیں لکھتے۔ مثلاً ابتدا، انتہا، ارتقا، اولیا، انبیا، املا وغیرہ۔ انگریزی کے دخیل الفاظ کے آخر میں ہمزہ لکھنا غلط ہے۔ مثلاً مارشل لا، باریٹ لا وغیرہ۔ مرکب عطفی کی صورت میں اس طرح لکھا جائے گا۔ شعراوادبا، فقراومساکین، آباواجداد، غیرہ۔

جن واحد مذکر لفظوں کے آخر میں ''ہ'' یا الف ہو اور ان کی جمع یائے تحتانی لگانے سے بن سکتی ہے اور ان کے فوراً بعد حرف عاملہ یعنی تک، سے، پر، میں، کو، کے وغیرہ سے کوئی حرف آئے تو اُردو املا میں یہ ''ہ'' یا ''الف'' کو یائے تحتانی سے بدل جائے مثلاً:

غلط املا	صحیح املا
آپ کے بارہ میں•••	آپ کے بارے میں•••
تمھارے بھروسہ پر•••	تمھارے بھروسے پر•••
اس ترجمہ کو•••	اس ترجمے کو•••

عربی کے متعدد الفاظ جو گول 'ۃ' سے رائج ہیں ان کو 'ت' سے لکھتے ہیں۔ مثلاً 'حیاۃ' کے بجائے 'حیات'، مساۃ کے بجائے 'مسمات'، اور مماۃ کے بجائے 'ممات'۔ فارسی سے دخیل الفاظ کبھی فارسی کے قاعدے پر اور کبھی مختلف انداز سے لکھے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ کا یہ املا مناسب ہوگا۔ مثلاً: آیندہ، جویندہ، آزمایش، آلایش، آرایش، آسایش وغیرہ۔

مصدر ''پذیرفتن'' (قبول کرنا ہے) سے بننے والے الفاظ کا املا اس طرح ہوگا جیسے، پذیرائی، دل پذیر، اثر پذیر وغیرہ۔

گزیدن (پسند کرنا، قبول کرنا) اور گزیدن (کاٹنا) سے بننے والے الفاظ 'ز' سے لکھے جائیں گے مثلاً جاگزیں، خلوت گزین، برگزیدہ، مردم گزیدہ، مارگزیدہ۔ گزرنا، گزارنا اُردو کے مصدر ہیں ان سے بننے والے الفاظ 'ز' سے لکھے جائیں گے مثلا: ''گزرنا، گزر جانا، گزارا، گزر وبسر، گزار دینا'' وغیرہ اُردو، ہندی اور انگریزی کے الفاظ میں ہمیشہ 'ز' لکھیں گے۔ الفاظ کے املا میں احتیاط ضروری ہے۔ مثلاً 'پراہ' کی بجائے 'پرواہ'، سینکڑوں کے بجائے 'سیکڑوں'، لاپرواہی کی جگہ 'لاپروائی'، عش عش کرنا کی بجائے 'اش اش کرنا' اور مصرعہ کے بجائے 'مصرع'۔

بعض الفاظ کے املا کا تعین ان کے معانی کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً:

نالا (ندی)	:	نالہ (فریاد)
ذرہ (چھوٹا ٹکڑا)	:	ذرا (تھوڑا، قلیل)
لالہ (گل لالہ)	:	لالا (لقب)
دانہ (بیج، دانہ، گندم)	:	دانا (عقل مند)
زہرا (حضرت فاطمہؓ کا لقب)	:	زُہرہ (ایک ستارہ)
زہرہ (پتا، دلیری، ہمت)		

اُردو کتابوں، رسالوں اور عبارتوں میں ہندسے بھی اُردو میں لکھنا مناسب اور انگریزی میں لکھنا غلط ہے۔ ایسے الفاظ جو کہ انگریزی کے توسط سے اُردو کے دامن میں شامل ہوئے ہیں ان کی جمع اُردو (نہ کہ انگریزی) قاعدے کے مطابق بنائی اور لکھی جائے گی مثلاً:

	غلط	صحیح
۱۔ اسکول	اسکولز	اسکولوں
۲۔ کالج	کالجز	کالجوں
۳۔ یونی ورسٹی	یونی ورسٹیز	یونی ورسٹیوں
۴۔ پروگرام	پروگرامز	پروگراموں
۵۔ چیلنج	چیلنجز	چیلنجوں

درج بالا تجاویز کے علمی اطلاق سے اُردو رسم الخط میں صحت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے بھی ضروری امر یہ ہے کہ املا میں ایک وحدت نظر آئے۔ جو بھی اُصول یا قوانین طے پائیں ان کی اشاعت اور ترویج کی جائے۔ کوئی باقاعدہ گروہ یا انجمن ملک بھر میں ہونے والی تحریری سرگرمیوں پر نظر رکھے اور املا کے انداز میں یکسانیت پیدا کرے۔

کوئی بھی زبان یا اُس کا رسم الخط خلا میں تخلیق نہیں ہوتے، ان کا تعلق انسانوں سے ہے جو اس رسم الخط کو اپنی توانائیوں سے پروان چڑھاتے ہیں۔ گل افشانی قلم اس کو رنگین بناتی ہے، حک و اصلاح کا عمل بھی اس میں برابر جاری رہتا ہے جو بے رنگ پھولوں میں خوشبو اور رنگ پیدا کرتا ہے۔ یہ عمل ہی کسی زبان اور رسم الخط کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا اُردو رسم الخط بھی بہتر سے بہترین کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

رسم الخط میں بہت سے رخنوں کے باوجود اُردو رسم الخط بہت جامعیت کا حامل ہے۔ اس کا دامن اپنے اندر سمیٹنے اور جذب کرنے کی بے انتہا صلاحیت رکھتا ہے اور یہی بات اس کو

خوب سے خوب تر بناتی ہے۔ کیوں کہ جب کوئی زبان یا رسم الخط ایک مقام پر آ کر رُک جاتے ہیں اور تبدیلی کا عمل رُک جاتا ہے تو وہیں اس کی موت کا سفر بھی شروع ہو جاتا ہے۔

حوالے:

۱ ''اُردو املا اور رموز اوقاف''، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ص ۱۰۲۔
۲ ''تدریس اُردو''، ڈاکٹر، فرمان فتح پوری، ص ۴۷۔
۳ ''منتخبات اُردو نامہ''، جلد اوّل، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۴۷۔
۴ ''اُردو رسم الخط کے بنیادی مباحث''، ڈاکٹر سہیل بخاری، ص ۱۲۔
۵ ''اُردو رسم الخط'' (انتخاب مقالات)، مرتبہ: شیما مجید، ص ۲۵۔
۶ Report of the commission on National Education Government of Pakistan, Ministry of Education, January-August 1959, Pg.302
بحوالہ ''اُردو رسم الخط اور ٹائپ''، ڈاکٹر طارق عزیز، ص ۲۸۔
۷ ''تدریس اُردو''، ڈاکٹر، فرمان فتح پوری، ص ۵۵۔
۸ Report of the commission of National Education Government of Pamistan, Ministry of Education, January-August 1959, Pg.302
بحوالہ ''اُردو رسم الخط اور ٹائپ''، ڈاکٹر طارق عزیز، ص ۲۸۔
۹ ''اُردو رسم الخط انتخاب مقالات''، مرتبہ: شیما مجید، ص ۴۷۔
۱۰ ''اُردو رسم الخط اور ٹائپ''، ڈاکٹر طارق عزیز، ص ۱۳۰۔
۱۱ ''اُردو رسم الخط (انتخاب مقالات)''، مرتبہ: شیما مجید، ص ۳۰۲، ۳۰۳۔

کتابیات

۱۔ رشید حسن خان: ''اُردو املا''، نیشنل اکاڈمی دہلی، ۱۹۷۴ء۔
۲۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: ''اُردو رسم الخط کے بنیادی مباحث''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء۔
۳۔ شیما مجید: ''اُردو رسم الخط، انتخاب مقالات''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔
۴۔ طارق عزیز، ڈاکٹر: ''اُردو رسم الخط اور ٹائپ''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ''تدریس اُردو''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔
۶۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''اُردو املا اور رموز اوقاف''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
۷۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر: ''منتخبات اُردو نامہ (جلد اوّل)''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء۔

O ------- O

ڈاکٹر عظمیٰ زمان

شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی زبانیں اور اُردو زبان کا آغاز

The Beginning of "Urdu" in Northern Areas

Abstract:

Dr. Uzma Zaman, Assistant Professor & Principal
F.G Girls College, Skardo.

There are many descriptions about the arrival of "URDU" in Northern areas.

1. As per understanding in the reflection of historical perspective was started from 1819 during the occupation of "Maha Raja Ranjeet Singh". Official Language in his time was Persian but for communication Hindko and Urdu were also popular languages.

'Munshi' (Middle Men) of ruling machinery preferred URDU for communication instead because of its understanding by army jawan of various backgrounds and public masses.

Finally, Urdu became the most popular amongst the state people and common public.

2. For the Political Reasons:- British Raj supported Urdu in amongst of Persian and Hindko their ruling interest.

3. Psychological Reasons:- To speak Persian became out of fashion during British Raj gradually specifically in ruling class for Dasi army persons and other officials to learn and speak an absolutely very stranger language English was very difficult in those times. In the mean while British high officials used to use Urdu communication among army soldiers so it became the most popular language-specially for the newly Commissioned Jawans (Young Army Men) to speak. Like Gora Sahib (High Rahed Officer) Urdu became and easier option.

4. Muslim Conscious Men:- After establishing "Ali Gad" college which had also Urdu medium option as language of education gained popularity in Muslim community throughout India.

5. 'URDU' had a developed script and grammar than other language of Northern region.

6. Finally, when it gained the status of the most popular lingua "Franka" of the region then it was adopted by creative people like poet, writers, singers and researchers as well as by among corporate business men of northern areas, now this situation is continuing till now.

اُردو زبان و ادب کے حوالے سے شمالی علاقہ جات ایک نیا ادبی گہوارہ ہے۔ اس علاقے میں اُردو کا ارتقاء ایک حیرت انگیز واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو کی آمد سے قبل یہاں چودہ زبانیں کسی نہ کسی صورت میں موجود تھیں۔ ان کی موجودگی میں اُردو ایک اجنبی زبان کے طور پر یہاں آئی اور اُس نے یہاں مستقل حیثیت حاصل کر لی۔

اُردو کی شمالی علاقوں میں موجودگی کئی سوالوں کو جنم دیتی ہے؟ مثلاً:

☆ اُردو کس طرح اس علاقے میں پہنچی؟

☆ اُردو نے کس طرح یہاں قدم جمائے؟

☆ اُردو نے کس طرح یہاں کی بولیوں اور زبانوں کو متاثر کیا؟

☆ اُردو نے کن وجوہات کی بناء پر یہاں نمائندہ زباں کی حیثیت اختیار کر لی؟

ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے شمالی علاقوں میں اُردو زبان کی آمد کا مفصل جائزہ لینا ضروری ہوگا۔ چناں چہ زیرِ تحریر مقالے میں اُردو زبان کے آغاز سے متعلق جائزے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اُردو کی آمد سے قبل بولی جانے والی زبانوں اُن کے ادب پر روشنی ڈالی جائے گی جب کہ دوسرا حصہ شمالی علاقہ جات میں اُردو زبان کے آغاز، ارتقاء اور محرکات کے جائزے پر مشتمل ہوگا۔

ہمارے خیال میں شمالی علاقوں میں مروج بولیوں اور زبانوں میں رابطے کی وہ قوت نہیں، جو اُردو زبان میں ہے مقامی زبانوں کے ادب میں وہ تنوع بھی نہیں جو مقامی باشندوں کا تزکیہ نفس کر سکے۔ چناں چہ مقامی زبانوں کے بارے میں تفصیل حاصل کرنے کے لیے اس مقالے کے پہلے حصے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

۱۔ اُردو کی آمد سے قبل بولی جانے والی زبانیں۔

۲۔ اُردو کی آمد سے قبل بولی جانے والی زبانوں کا ادب۔

(۱)

حصہ اوّل: اردو کی آمد سے قبل بولی جانے والی زبانیں:

۱۔ پنجابی زبان وادب ۲۔ شینا زبان وادب

۳۔ بلتی زبان وادب ۴۔ پشتو زبان وادب
۵۔ بروشسکی زبان وادب ۶۔ کوہستانی زبان وادب
۷۔ فارسی زبان وادب ۸۔ کشمیری زبان وادب
۹۔ گوجری زبان وادب ۱۰۔ کھوار زبان وادب
۱۱۔ واخی زبان وادب ۱۲۔ ڈوگی زبان وادب
۱۳۔ کاشغری زبان وادب ۱۴۔ ہندکو زبان وادب
۱۵۔ انگریزی زبان وادب

مجموعی طور پر شمالی علاقہ جات میں اس وقت اردو کے علاوہ پندرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ان زبانوں کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

الف۔ وہ زبانیں جن کا اپنا رسم الخط اور ادبی سرمایہ ہے اور شمالی علاقہ جات میں ان کے ادب نے ترقی کی۔ درج ذیل ہیں:

۱۔ بلتی ۲۔ فارسی
۳۔ شینا ۴۔ بروشسکی
۵۔ کھوار

ب۔ وہ زبانیں جن کا اپنا رسم الخط اور ادبی سرمایہ ہے لیکن ان کے ادب نے شمالی علاقہ جات میں ترقی نہیں کی مثلاً:

۱۔ کاشغری ۲۔ وخی

ج۔ وہ زبانیں جن کا رسم الخط نہیں ہے اور ان کا ادبی سرمایہ کسی دوسرے رسم الخط میں ہے مثلاً:

۱۔ پنجابی (اردو) ۲۔ پشتو (عربی)
۳۔ ہندکو (اردو) ۴۔ گوجری (اردو)
۵۔ کشمیری (اردو)

د۔ وہ زبانیں جنہوں نے لسانی روابط کے ذریعے جنم لیا، ان زبانوں کا کوئی مخصوص رسم الخط اور ادبی سرمایہ نہیں۔ یہ صرف بولی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ڈوگی ۲۔ کوہستانی

اس موقع پر یہ وضاحت کر دی جائے کہ شمالی علاقہ جات کی زبانوں اور بولیوں کی قدامت پر تحقیق جاری ہے۔ اب تک بہت سی زبانوں کی اصل اور قدامت واضح نہیں ہو پائی۔ تاہم صدیوں پہلے سے رائج زبانوں کو اب تک ہونے والی تحقیق کی روشنی میں درج ذیل ترتیب دی جاتی ہے: [1]

۱۔ پنجابی	۲۔ شینا
۳۔ بلتی	۴۔ پشتو
۵۔ بروشسکی	۶۔ کوہستانی
۷۔ فارسی	۸۔ کشمیری
۹۔ گوجری	۱۰۔ کھوار
۱۱۔ کاشغری	۱۲۔ وخی
۱۳۔ ڈوگری	۱۴۔ ہندکو
۱۵۔ انگریزی	

حصہ دوم: اُردو کی آمد سے قبل بولی جانے والی زبانوں کا ادب:

۱۔ پنجابی:

پنجابی زبان شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی قدیم زبانوں میں ایک ہے۔ یہ ان زبانوں میں سے ہے، جو مہاراجا رنجیت سنگھ (۱۸۱۹ء) کے ساتھ ساتھ اس سرزمین میں داخل ہوئیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے کشمیر میں دورِ حکومت (۱۸۱۹ء۔ ۱۸۳۹ء) اور بعدازاں مہاراجا گلاب سنگھ کی شمالی علاقہ جات پر حکومت (۱۸۴۰۔ ۱۸۵۷ء) کے دورانِ سکھوں کا عمل دخل ان علاقوں میں رہا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ لاہور دربار کے ماتحت تھا اور مہاراجا گلاب سنگھ رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازم رہا۔ ان دونوں مہاراجاؤں کی افواج میں سِکھ، ڈوگرے، پختون اور پنجابی اقوام کے افراد شامل تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انتظامی معاملات کے لیے پنجاب سے آنے والے سرکاری ملازمین، افواجِ پاکستان، سیاحوں اور پنجابی تاجروں کے ذریعے یہ زبان اپنی جگہ بناتی چلی گئی۔

"پنجابی زبان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا پنجاب میں خود انسان کا وجود۔ ۲ اس زبان کے مختلف لہجے اور مختلف نام رائج رہے اور پنجابی زبان نے مختلف تہذیبوں کا سفر طے کیا۔ موجودہ پنجابی پر عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے اثرات بھی رہے۔ ۳ پاکستان میں اس زبان کے بولنے والوں میں اردو زبان کے حروفِ تہجی اور رسم الخط مستعمل ہے۔"

پنجابی ادب قدامت کے اعتبار سے متعدد مغل اور سلاطینِ دہلی کے ادوار کا احاطہ کرتا ہے۔ اس زبان کے شعراء میں بابا فرید الدین گنج شکر، امیر خسرو، شاہ حسین، سلطان باہو، سیّد وارث شاہ، سیّد بُلھے شاہ جیسے نامور شعراء موجود ہیں۔ جب کہ نثری ادب میں مولوی قادر بخش احمد آبادی، حاجی محمد دین گجراتی، مولوی غلام رسول شامل ہیں۔ ۴ جدید دور میں پنجابی نظم و نثر لکھنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تاہم شمالی علاقہ جات کے ادب میں ابتدا ہی میں پنجابی کے اثرات نمایاں رہے ہیں۔ اس زبان کے بولنے والے شمالی علاقہ جات میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اگرچہ ان علاقوں میں پنجابی زبان میں ادب تخلیق نہیں ہو رہا، تاہم پنجابی زبان کے اثرات بعض مقامی زبانوں کے ادب پر واضح طور پر موجود ہیں۔

۲۔ شینا:

شینا زبان اس وقت شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی زبانوں میں سب سے قدیم زبان کہلاتی ہے۔ اس زبان کی قدامت کا سلسلہ دسویں صدی قبل مسیح سے قائم کیا جاتا ہے۔ ۵ اس زبان کے بولنے والوں میں "شین" اور "دیشکن" اقوام شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس زبان کا اصل رسم الخط سنسکرت سے ملتا ہے۔ ۶ یہ قیاس اس مخطوطے سے کیا جاتا ہے جو Gilgit Manuscript کے نام سے گلگت کے نواح میں کھدائی (۱۹۳۷ء) سے برآمد ہوا لیکن یہ رسم الخط محض عجائب گھر کے ایک نسخے تک محدود ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس زبان کو غیر تحریری زبان تصور کیا جاتا رہا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زبان کے لیے کوئی رسم الخط متعین نہیں تھا۔ اکبر حسین اکبر کی تحقیق کے مطابق "سترہویں صدی کے ایک قلمی نسخے کے مطابق یہ زبان فارسی رسم الخط میں لکھی گئی۔" ۷ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر شجاع

ناموس نے پہلی مرتبہ اردو رسم الخط کے مطابق شینا حروفِ تہجی کی تعداد ۵۶ پیش کی۔ ۸؎ جس میں شینا کی آوازوں کے تحت کچھ زائد حروفِ تہجی پیش کیے گئے۔ ۱۹۷۷ء میں ناردرن ایریا سوشل اینڈ کلچرل ایسوسی ایشن نے شینا کے حروفِ تہجی متعین کرنے کی کوشش کی۔ ۹؎ تاہم ان کی تعداد پر متفقہ فیصلہ نہیں ہوسکا۔ ۱۹۸۶ء میں امین ضیا نے شینا حروفِ تہجی کو ایک نئی شکل دے کر ان حروف کی تعداد ۳۴ مقرر کی۔ ۱۰؎ جس میں بعد ازاں ۱۹۸۹ء میں عبدالخالق تاج نے شینا قاعدہ مرتب کر کے اس میں چند اضافوں کے ساتھ یہ تعداد ۴۰ کر دی۔ ۱۱؎ شینا زبان ان زبانوں میں شامل ہے جن کو دردی زبانوں کی ایک شاخ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ۱۲؎ شمالی علاقہ جات میں اس زبان کے بولنے والوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ شینا زبان کے ادب کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس کے دو مختلف ادوار سامنے آتے ہیں۔ وزیر محمد اشرف ان ادوار کی درج ذیل تقسیم پیش کرتے ہیں:

۱۔ دینِ اسلام سے قبل شینا ادب

اُس دور میں شینا شاعری لوک گیتوں پر مشتمل تھی، جن کی قدیم اقسام برانگی گائی، چنہ گائی اور دورژ گائی بتائی گئی ہیں۔ ۱۳؎ اُسی دور میں ضرب الامثال اور لوک کہانیوں کا ذکر بھی ملتا ہے، جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔

۲۔ شینا ادب کا مسلم دور

اس دور کے ادب کے بارے میں وزیر محمد اشرف خان کی رائے ہے:

> ''شینا میں باضابطہ شاعری مسلمانوں کے دورِ حکومت میں شروع ہوئی۔ فارسی طرز پر شعر کہنے کا آغاز بھی شیعوں اور یشکنوں نے مسلم دور میں شروع کیا۔ نظم، رزمیہ، غزل اور قطعہ کے نمونے ہمیں اس دور میں ملتے ہیں۔'' ۱۴؎

اسلام کے اثر سے شینا ادب میں جو تبدیلی آئی، اس کے بارے میں فضل الرحمٰن عالمگیر لکھتے ہیں۔

> ''تیرھویں صدی عیسوی میں جب اس علاقے میں اسلام پھیلا تو لازمی طور پر ہر شعبۂ حیات پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ ایک کٹر اسلامی

معاشرے کے قیام سے صدیوں پرانے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے بُت پاش پاش ہوگئے۔ زندگی کے اقدار بدل گئے۔ اس کا اثر شعرو شاعری اور موسیقی پر بھی پڑا، البتہ اُس دور میں صوفیانہ شاعری کا رواج عام ہوا اور اس کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شینا شاعری میں عشقیہ شاعری کے مقابلے میں عارفانہ کلام کا معیار بلند ہے۔" ۱۵

اُس دور میں مذہب کے زیر اثر دعا، مناجات، حمد، نعت، نوحہ اور مرثیہ وغیرہ کی اصناف متعارف ہوئیں۔ اُس دور کے مشہور شعراء میں محمد رضا، اخوند مہربان، وزیر احمد خان، رحمت جان ملنگ وغیرہ شامل ہیں۔ رحمت جان ملنگ کو شینا شاعری میں اختر شیرانی سے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔ ۱۶

شمالی علاقہ جات کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے سیّد عالم نے شینا ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۷

۱۔ منظوم لوک ادب ۲۔ منثور لوک ادب

منثور لوک ادب میں انھوں نے لوک کہانیوں کے علاوہ لطائف، پہیلیوں، ضرب الامثال اور تشبیہات کے ساتھ ساتھ محاوروں کو بھی شامل کیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد شینا ادب میں وسعت پیدا ہوئی، نثر اور شاعری میں طنز و مزاح کی روایت پڑی۔ ۱۸ مقامی طور پر شینا زبان تحریر کی جانے لگی۔ اس صورتِ حال کے بارے میں اکبر حسین اکبر لکھتے ہیں:

"۱۹۵۲ء میں ریڈیو پاکستان سے جب شینا پروگرام کی ابتدا ہوئی تو اس میں کام کرنے والوں نے اردو رسم الخط کے ذریعے شینا اسکرپٹ لکھنے شروع کیے۔ ۱۹

اب شینا بولنے والوں نے شینا زبان لکھنے کے لیے مستقلاً اُردو رسم الخط اپنا لیا ہے۔

۳۔ بلتی:

بلتی زبان و ادب کا ماضی شمالی علاقہ جات میں پائے جانے والی مقامی زبانوں میں قدامت کے اعتبار سے اور بولے جانے والے افراد کی تعداد کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔ اس زبان کی ابتدا تبت میں ساتویں صدی عیسوی سے وابستہ کی جاتی ہے اور

اسی نسبت سے بلتستان کو ''تبت خورد'' اور ''بولر'' ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ان زبانوں میں سے ایک ہے، جو اپنا ایک منفرد رسم الخط رکھتی ہیں۔ اس رسم الخط کو ''ای۔ گے'' کہا جاتا ہے۔

اس رسم الخط کے بارے میں بلتی زبانوں کے ماہر یوسف حسین آبادی کہتے ہیں:

> ''یہ رسم الخط اصل میں ساتویں صدی عیسوی میں سنسکرت، دیوناگری سے لیا گیا تھا۔ اس میں اُس وقت کی مذہبی تعلیمات، تقلیمیں اور خطوط لکھے جاتے تھے۔ اس وقت تعلیم عام نہ تھی۔ صرف اعلیٰ طبقے کے چند افراد اور لامے اس طرزِ تحریر سے واقف تھے۔'' [۲۰]

البتہ پانچ سو سال سے قبل یہ رسم الخط ترک کر دیا گیا ہے۔

بدھ مت کے ادوار میں یہ رسم الخط مذہبی تعلیمات کے لیے استعمال ہوا۔ اشاعتِ اسلام کے بعد تبت اور بلتستان مذہبی اور لسانی لحاظ سے الگ الگ ہو گئے۔ نہ صرف یہ کہ بلتی زبان میں بدھ مت کی مذہبی اصطلاحات کی جگہ عربی و فارسی کی اسلامی اصطلاحات نے لے لی، بلکہ فارسی کا رسم الخط بھی اپنا لیا گیا۔ ابتدا میں مذہب کے لیے فارسی رسم الخط کو بروئے کار لایا گیا، لیکن بعد ازاں ادب کے لیے بھی اسی کو اختیار کیا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں ڈوگرہ تسلط کے بعد ڈوگری، ہندی اور اردو کے حروف بلتی تحریروں میں شامل ہو گئے اور اردو رسم الخط کو بھی اختیار کیا گیا۔ اگرچہ ۱۹۸۴ء میں اس زبان کا رسم الخط اور حروفِ تہجی ماہرین کی مدد سے منظرِ عام پر لائے گئے۔ لیکن یہ رسم الخط چند افراد تک ہی محدود رہا اور ادب کے لیے فارسی رسم الخط پر ہی انحصار کرنا پڑا۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ:

> ''صدیوں سے بلتی زبان کے لیے فارسی رسم الخط کا استعمال رائج رہنے کی وجہ سے بلتی ادب کا سارا ذخیرہ اسی رسم الخط میں موجود ہے اور اس سے دامن چھڑانا بلتی زبان کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔'' [۲۱]

ابتدا میں بلتی زبان نظموں اور لوک کہانیوں تک محدود رہی۔ بعد ازاں اس میں نئی نئی اصناف متعارف ہوتی گئیں۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند'' میں علاقائی ادب کے ذیل میں بلتی ادب میں ''منظوم ادب اور لوک کہانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ [۲۲] منظوم ادب میں شاعری کی محض ایک صنف ''رگیانگ خلو'' کا تذکرہ کیا گیا ہے، جب کہ بعد ازاں بلتی زبان

کے محقق یوسف حسین آبادی نے وضاحت کرتے ہوئے بلتی شاعری کی دیگر قدیم اصناف پر روشنی ڈالی ہے، جن میں ''رگیانگ خلو'' کے علاوہ ''زودرونگ خلو''، ''بودھ خلو''، اور ''خلو'' یعنی چار اصناف کا ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ ''رگیانگ خلو'' کو نظموں کا سردار کہا گیا ہے۔[۲۳] یہ صنفِ شاعری نظمِ معریٰ سے مشابہت رکھتی ہے۔ یہ قدیم زمانے میں مقبول رہی۔ بعد ازاں لوک کہانیوں اور لوک گیتوں کا رواج ہوا۔ اسلام کی آمد کے بعد نعت، مراثی اور قصائد کو فروغ حاصل ہوا۔ قصیدہ اور مرثیہ بلتی شاعری کی محبوب اصناف ہیں۔ بلتی مرثیہ گو شعراء میں راجہ حسین خان محبؔ کا درجہ بہت بلند مانا جاتا ہے۔ انھیں فنِ مرثیہ گوئی میں ''میر انیس'' کے برابر مقام دیا جاتا ہے۔[۲۴] جب کہ ''راجہ حیدر خان حیدرؔ (۱۸۰۰ء۔۱۸۴۰ء) کو قومی گیتوں میں اعلیٰ پائے کا حامل ہونے کی وجہ سے مقامی طور پر پہلا قومی شاعر قرار دیا جاتا ہے۔[۲۵]

بلتی شاعری کو اس زبان کے ماہرین نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:[۲۶]

۱۔ بدھ مت کے دور میں مذہبی تعلیمات پر مبنی نظمیں عام تھیں۔ بعد ازاں لوک کہانیوں اور لوک گیتوں کا رواج ہوا۔ اشاعتِ اسلام کے بعد یعنی چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں نئے موضوعات قصیدہ، مرثیہ، سلام، نوحہ اور ہجو اور بحرِ طویل وغیرہ شاعری میں در آئے۔

۲۔ بلتی شاعری کا دوسرا دور ۱۸۴۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں براہِ راست ڈوگروں کی غلامی میں آجانے سے اس قوم میں مذہبی اور قومی شاعری کا رجحان پنپتا نظر آتا ہے۔ اس دور کے شعراء میں بلتی زبان کے مشہور شعراء راجہ حیدر خان، راجہ مراد خان، جوہر علی جوہرؔ، راجہ حاتم حسین خان محبؔ وغیرہ گزرے ہیں، جن کی شعری روایت کا تتبع اب تک بلتی شاعری میں کیا جاتا ہے۔

۳۔ قیام پاکستان کے بعد سے تا حال کے زمانے کو بلتی شاعری کا تیسرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں شاعری کی بیشتر اصناف پر طبع آزمائی کی جارہی ہے۔ بیشتر بلتی شعراء اس دور میں اردو شاعری کی طرف راغب ہوئے۔

نثر میں بھی بلتی زبان کا دامن وسیع ہے۔ ابتدا میں لوک کہانیوں کی روایت عام رہی۔ ان کہانیوں میں سے بعض مقامی ہیں اور بعض ماورائی کرداروں سے متعلق ہیں۔ ان لوک کہانیوں میں بلتستان کے تہذیب و تمدن کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ان

داستانوں میں سے ''کیسر کی کہانی'' کے علاوہ داستانیں تصنیف نہیں ہوسکیں۔

لوک ادب میں دوسری اہم چیز بلتی زبان کے ضرب الامثال اور محاورے ہیں۔ اب تک تو یہ نسل در نسل چلتے آرہے تھے، لیکن اب تصنیف شدہ صورت میں موجود ہیں۔ ۲۷

نثر میں ڈرامے بھی بلتی ادب کا اہم حصہ رہے ہیں۔ ان ڈراموں کی ابتدا لوک کہانیوں سے ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بہت سے بلتی ڈراموں کو فیچر کی شکل میں ریڈیو سے نشر کیا گیا۔

اب بلتی زبان کے رسم الخط کے طور پر اردو کو مستقلاً اپنا لیا گیا ہے اور ''مقتدرہ قومی زبان'' اسلام آباد کے شائع کردہ اردو بلتی قاعدے میں ۴۷ حروفِ تہجی ترتیب دیے گئے ہیں۔ ۲۸ اور بلتی زبان کی چند مخصوص آوازوں کی ضرورت کے پیشِ نظر سات حروفِ تہجی کا اضافہ کر کے سات آوازیں ایجاد کی گئی ہیں۔ یوں یہ زبان مزید وسعت کی حامل ہوگئی۔

۴۔ پشتو:

شمالی علاقہ جات میں صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والی اقوام کی اکثریت موجود ہے۔ ان کی باقاعدہ آمد کا سلسلہ ڈوگرہ افواج کی شمالی علاقوں میں آمد کے ساتھ ہی چل نکلا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے گلگت پر حملے ۱۸۴۶ء کے وقت اس کے ہمراہ افواج میں پشتو زبان بولنے والے سپاہیوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۲۹ یہی صورتِ حال ۱۸۹۱ء تک برقرار رہی، جب نگر اور ہنزہ کی ریاستوں پر حملہ کیا گیا۔ اس فوج میں تقریباً ''دوسو جوان اسپیڈنگ کمپنی کے پٹھان'' موجود بتائے جاتے ہیں۔ ۳۰ بعد ازاں یہ سلسلہ شمالی علاقوں میں پٹھانوں کے مستقل قیام کا ایک ذریعہ بن گیا۔ انگریزوں کے ذریعے ذرائع مواصلات کی اصلاح کے زمانے ۱۸۹۹ء میں جناب غلام رسول کے مطابق صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ:۔

> ''سری نگر سے لے کر گلگت تک تقریباً ۲۴۰ میل لمبی گھوڑے کی سڑک کی تعمیر کے لیے ایک انگریز فرم M/s Spedding Co. کو ٹھیکہ دیا، جس نے اس کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے پانچ ہزار قلی لگائے۔ ان میں مقامی قبیلوں کے علاوہ آفریدی، خیبری، پشاوری، کابلی، کشمیری، سواتی اور پنجابی بھی شامل تھے، جن میں سے کچھ سربرآوردہ پٹھان یہاں سڑک کی تعمیر کے بعد آباد ہوگئے۔'' ۳۱

اس کے بعد شمالی علاقوں میں قیام پذیر ان افراد کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد صوبہ سرحد سے انتظامی صورتِ حال سنبھالنے والے افسران کے دور میں سرکاری ملازمین میں بھی صوبہ سرحد کے عوام شامل ہوتے چلے گئے۔ اس وقت سرکاری ملازمین اور افوارج پاکستان کے علاوہ تاجر طبقے میں بھی پختونوں کی خاطر خواہ تعداد شمالی علاقہ جات میں مقیم ہے۔ یہ مقامی زبانوں سے ناواقف ہیں۔ مقامی اقوام سے رابطے کی خاطر اردو زبان ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ ان افراد نے اگرچہ اب تک اردو ادب کی کسی صنف پر طبع آزمائی نہیں کی۔ تاہم شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی زبانوں کے اعتبار سے پشتو ایک واضح مقام رکھتی ہے۔ پشتو، صوبہ سرحد میں بولی جانے والی قدیم زبان ہے۔ اس زبان کو ''ہندوستان کی سب سے قدیم زبان'' بھی کہا گیا ہے۔ ۳۲ لسانی گروہ کے اعتبار سے اسے ''آریائی زبانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔'' ۳۳

یہ زبان عربی رسم الخط کی پیروی میں خطِ نسخ میں لکھی جاتی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی کے مطابق پشتو زبان میں ۴۴ حروفِ تہجی ہیں۔ ان حروفِ تہجی میں اردو کے علاوہ سات حروفِ تہجی کا اضافہ کیا گیا ہے، جو پشتو کی اپنی مخصوص آوازوں پر مشتمل ہیں۔ یعنی ح خ، ز، س، ن، ی، ی۔ ۳۴

پشتو ادب میں نثر و نظم دونوں میں لوک ادب کا ضخیم سرمایہ موجود ہے، پشتو کے قدیم شعراء میں رحمان بابا، خوشحال خان خٹک، مرزا خان انصاری، عبدالحمید مومند جب کہ نثر میں محمد ابو ہاشم سردانی، سلیمان وکو، خوشحال خٹک اور افضل خان خٹک کے نام لیے جاتے ہیں۔ پشتو زبان و ادب مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے اور صوبہ سرحد میں تقریباً تمام اصنافِ ادب پر طبع آزمائی کی جارہی ہے۔ ۳۵

۵۔ بروشسکی:

بروشسکی زبان، شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی تیسری بڑی زبان ہے۔ یہ شمالی علاقہ جات کے تین مختلف خطوں ہنزہ، نگر اور یاسین میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان بنیادی طور پر ''بروشو'' خاندان سے وابستہ سمجھی جاتی ہے۔ ۳۶

بروشسکی ان زبانوں میں سے ایک ہے جس کی قدامت اور ساخت پر اب تک تحقیق جاری ہے۔ لیکن حتمی نتائج پیش نہیں کیے جاسکے۔ البتہ اب عربی رسم الخط میں بروشسکی حروفِ تہجی متعین کیے گئے ہیں۔ جن کی تعداد ۵۰ ہے۔ اردو حروفِ تہجی میں بروشسکی ضرورت کے مطابق ۱۴ حروف اور آوازوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں:

بروشسکی زبان کا اوّلین سرمایہ لوک ادب ہے، جس میں لوک کہانیاں ۳۷ اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ اگلی نسل تک منتقل ہوتی رہیں۔ البتہ تحریری ادب کے بارے میں ''تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند'' میں درج ذیل وضاحت کی گئی ہے:

> ''چوں کہ بیسویں صدی عیسوی کے رابع دوم سے پہلے تک ریاست ہنزہ میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، لہٰذا یہاں کے باشندوں کی اکثریت لکھنے پڑھنے سے محروم تھی۔ اس لیے چند قلمی تحریروں کے سوا باقی کچھ محفوظ نہ رہ سکا۔'' ۳۸

یہی چند قلمی تحریریں بروشسکی ادب کی بنیاد بنیں۔ بعد ازاں شاعری کے کچھ نمونے سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر بروشسکی زبان میں در آئے۔ اس میں عام شاعری کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت کا عنصر نمایاں رہا۔ البتہ قبولِ اسلام کے بعد مناقب، مناجات، قطعات، پہیلیاں، لوریاں اور مرثیے کی اصناف بھی بروشسکی زبان میں داخل ہو گئیں۔ بروشسکی کا لوک ادب انہی تک محدود رہا، البتہ قیام پاکستان کے بعد اس زبان میں شاعری کا آغاز ہوا۔ بروشسکی زبان میں شعر کے لیے ''بیت'' کا لفظ رائج ہے۔ ۳۹

سب سے پہلے بروشسکی ابیات میں ''نغمۂ اسرافیل'' کے نام سے ڈاکٹر علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہنزائی کا مجموعۂ کلام (۱۹۵۵ء) چھپ کر منظرِ عام پر آیا، جس کے بعد جناب غلام الدین غلام، عزیز اللہ نجیب اور فدا علی ایثارؔ نے اس شعری روایت کو ساٹھ کے عشرے میں ہی آگے بڑھایا۔

بروشسکی نثری سرمائے میں محض چند ڈرامے ہیں، جو ریڈیو پاکستان گلگت سے فیچر کی شکل میں نشر کیے گئے۔ ان ڈراما نگاروں میں غلام عباس، سخی احمد جان، شیر باز خان اور پروفیسر شاہد علی کے نام نمایاں ہیں۔ ۴۰

اب حروفِ تہجی متعین ہونے اور بروشسکی زبان کے قواعد مرتب ہونے کے بعد امید واثق ہے کہ اس زبان میں ادبی سرمایہ بڑھے گا۔

۶۔ کوہستانی:

شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی زبانوں میں سے یہ چوتھے نمبر پر ہے۔ اس زبان کو 'درد' زبانوں میں شامل سمجھا گیا ہے۔[۴۱] ڈاکٹر شجاع ناموس نے بھی کوہستانی زبان کو 'درد' خاندان میں شامل کیا ہے۔[۴۲] لیکن بعد کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ کوہستانی زبان دراصل شینا زبان کا ایک الگ لہجہ ہے۔[۴۳] یہ الگ زبان کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بشام، تھاکوٹ سے تاہر بن کا علاقہ ''کوہستان'' کہلاتا ہے۔ اس علاقے کے لوگ شینا کے مقامی لہجوں کے برعکس ایک مخصوص سخت لہجہ استعمال کرتے ہیں، جس کے باعث کوہستانی کو غیر ملکی ماہرین نے الگ زبان سمجھا اور بعد ازاں یہی رائے پختہ ہوتی چلی گئی۔

گلگت کے خطے میں زبان کا یہی لہجہ رائج ہے۔ ادب میں اس زبان میں اب تک کوئی کام منظرِ عام پر نہیں آیا۔ خیال واثق ہے کہ اس زبان میں ادب تخلیق نہیں کیا گیا اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والے اردو رسم الخط ہی کا استعمال کرتے ہیں۔

۷۔ فارسی:

تقسیم کشمیر سے قبل صوبۂ کشمیر میں ''کشمیری زبان''، ''صوبہ جموں میں''، ''ڈوگری زبان''، جب کہ لدّاخ میں ''بلتی'' اور گلگت کے صوبے میں ''شینا'' اور ''بروشسکی'' زبانیں رائج تھیں۔ تاہم دفتری زبان پوری ریاست میں ''فارسی'' ہی تھی۔

کشمیر میں مغل بادشاہوں کی پذیرائی نے فارسی کا درجہ نہ صرف سرکاری زبان کے طور پر بلند کر رکھا تھا، بلکہ کشمیر کو اس زبان کی ادبی ترقی کی وجہ سے ایرانِ صغیر کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ شمالی علاقوں میں علم و ادب کے اوّلین سرمایے کا پسِ منظر بھی ہمیں کشمیر سے وابستہ نظر آتا ہے۔ یہ سرمایہ ان مبلغین کی دین ہے، جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے چودھویں صدی عیسوی میں بلتستان تشریف لائے۔ ان مبلغین کے ہمراہ خُدّام بھی ایرانی النّسل تھے۔ ان بزرگان اور خُدّام کے ذریعے فارسی علم و ادب اور فارسی رسم و رواج کو فروغ ملا۔ ''بلتستان میں فارسی ادبیات'' کے عنوان سے محمد حسن حسرت لکھتے ہیں:

''تواریخ کے مطابق امیر کبیر سیّد علی ہمدانی کے ہمراہ سات سو افراد آئے تھے۔ یوں

ان مغلوں نے بلتیوں کو نہ صرف دینِ اسلام سے مشرف کیا، بلکہ بلتستان میں علم و فن کے وہ موتی بکھیرے، جس کی بدولت یہاں کے معاشرتی آداب، رہن سہن، خورد و نوش، لباس، رسم و رواج اور ادب و شاعری پر ایرانی رنگ چڑھنے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو اتنا فروغ ملا کہ اہلِ بلتستان نے قدیم رسم الخط "اِگے" کو ترک کر کے فارسی "نستعلیق" کو اپنانا شروع کر دیا۔"[۴۴]

فارسی ادب نے اس علاقے کی ادبی روایات پر گہرے اثرات مرتب کیے، شمالی علاقوں میں بلتستان وہ خطہ ہے، جہاں اسلام کی روشنی سب سے پہلے پھیلی۔ اس علاقے میں قدیم فارسی تصانیف کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ قدامت کے اعتبار سے اُن تصانیف کو اوّلیت حاصل ہے، جو امیر کبیر سیّد علی ہمدانی نے شمالی علاقہ جات کے علاقے "بلتستان" میں قیام کے دوران رقم کیں۔ ان تصانیف میں فارسی کے علاوہ عربی مندرجات بھی شامل ہیں۔ قدیم فارسی تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔	"ذخیرۃ الملوک" از سیّد علی ہمدانی	(نثر)	(۱۳۸۵ء)
۲۔	"المودۃ القربیٰ از سیّد علی ہمدانی"	(نثر)	(۱۳۸۵ء)
۳۔	"شغر نامہ" از سیّد تحسین	(منظوم)	(سنہ ندارد)
۴۔	"فضل الخطاب" از سیّد نجم الدین ثاقب	(منظوم)	(۱۷۳۶ء)
۵۔	"دیوانِ تحسین" از سیّد تحسین	(منظوم)	(سنہ ندارد)
۶۔	"فارسی بلتی نعت" از سیّد فضل علی شاہ	(منظوم)	(سنہ ندارد)
۷۔	"قاطع البرہان" از سیّد اکبر علی	(نثر)	(۱۹۱۰ء)
۸۔	"زاد الجنان" از سلطان علی یلغاری	(منظوم)	(۱۹۱۷ء)
۹۔	"مشجر الاولیا" از سیّد نور بخش	(نثر)	(سنہ ندارد)

ان تمام تصانیف کے مندرجات میں دنیاوی اور اُخری زندگی کو بہتر بنانے کے اصولوں پر زور دیا گیا ہے اور قرآنِ مجید سے عربی مندرجات شامل کر کے مثالیں دی گئی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ قدیم شعراء کا زیادہ تر کلام فارسی میں موجود ہے۔ ان میں سیّد فضل شاہ (پ۔ ۱۲۷۵ھ، م۔ ۱۳۵۴ھ) راجہ حاتم خان (زمانہ تصنیف ۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۰ء) اور راجہ محمد علی شاہ بیدلؔ (پ ۱۹۰۰ء م ۱۹۶۰ء) وغیرہ مشہور ہیں۔

بلتستان کے برعکس گلگت کے خطے میں فارسی کا مذہبی وعلمی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ دیوانِ حافظ، گلستان، بوستان اور کریما کا مطالعہ پند ونصائح کے لیے کیا جاتا رہا۔ ادب میں فارسی کا استعمال محض حمد پڑھنے تک رہا۔[۴۶] البتہ بول چال اور ذاتی استعمال کے لیے فارسی کا استعمال عام تھا۔ دینی تعلیم کے لیے ایک طویل عرصے تک فارسی کی کتابوں سے ہی استفادہ کیا جاتا رہا، بلکہ باقاعدہ اسکول کا آغاز ہونے سے قبل تعلیم کا انحصار انھی کتب پر رہا۔ شمالی علاقہ جات میں پہلے اسکول کے قائم ہونے (۱۸۹۲ء) پر ذریعۂ تعلیم اردو ہی اختیار کیا گیا، کیونکہ انگریز اس علاقے کو ایجنسی بنا چکے تھے۔ ڈوگرہ حکومت کا عمل دخل انتظامی معاملات میں موجود تھا۔ انگریز تمام مقامی زبانوں سے کسی حد تک واقف تھے، مگر شمالی علاقوں میں ایجنسی کے قیام (۱۸۷۷ء) سے لے کر ان کا وتیرہ یہی رہا کہ انگریزی خطاب کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کیا جاتا، جو تمام مقامی عوام کے لیے رابطے کی زبان بن چکی تھی۔ سرکاری کاغذات کی زبان اردو تھی۔ لہٰذا ذریعۂ تعلیم کے لیے بھی اردو ہی کو اختیار کیا گیا۔ یوں فارسی محض خطوط اور چند سرکاری کاغذات کی حد تک باقی رہ گئی۔ آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ مکمل طور پر اردو نے لے لی۔

۸۔ کشمیری:

کشمیری زبان شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی زبانوں میں ترتیب کے اعتبار سے چھٹے نمبر پر ہے۔ اس زبان کا قدیم رسم الخط ''شاردا'' کہلاتا تھا،[۴۷] جو ہندی سے وابستہ ہے۔ عہدِ مغلیہ تک یہ رسم الخط استعمال کیا جاتا رہا۔ مغل عہد میں فارسی کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ رسم الخط متروک ہوگیا اور ''خطِ نسخ'' جاری رہا۔ یہ تبدیلی کشمیر میں اسلام کی آمد کے ساتھ یعنی سیّد علی ہمدانیؒ کی آمد سے ساتھ ہوئی۔ میر عبدالعزیز اس تبدیلی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''فارسی زبان میں جتنی بھی اہم کتابیں تھیں، اُن کا ترجمہ کشمیری فارسی دانوں نے کشمیری زبان میں کیا۔ چوں کہ اس وقت کشمیری کا اپنا رسم الخط نہیں تھا، اس لیے فارسی کے نستعلیق رسم الخط کو ہی کشمیری کے لیے اپنایا گیا۔[۴۸]

گریرسن (۱۹۶۳ء) کے الفاظ میں دردی زبانوں میں صرف کشمیری زبان ایسی ہے، جس کی الگ تحریری خصوصیت اور ادب موجود ہے۔[۴۹] اس زبان کا ابتدائی ادبی

سرمایۂ للہ عارفہ کے کلام ''للہ واکھ'' کو سمجھا جاتا ہے۔۵۰ چودھویں صدی کے اوائل میں یہ زبان سنسکرت اور ہندی کے واضح اثرات لیے ہوئے تھی۔ البتہ اسلامی دور (چودھویں صدی عیسوی) میں کشمیری زبان کو وسعت ملی اور ''اس کا خزانہ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ و تراکیب سے بھر گیا''۔ ۵۱ فارسی کی ترویج سے کشمیری زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ کشمیر میں بولی جانے والی کشمیری زبان کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ وہ کشمیری، جسے مسلمان گھرانوں میں رواج حاصل ہے۔
۲۔ وہ کشمیری جو ہندوؤں کے پنڈت گھرانوں میں بولی جاتی ہے۔
۳۔ ٹھیٹ اور کھردری کشمیری، جسے ''گامی کشمیری'' کا نام دیا گیا ہے۔
۴۔ نفیس و مصفّٰی کشمیری، جسے ''کندور کشمیری'' کا نام دیا گیا۔''۵۲

کشمیری ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ابتدا اٹھارویں صدی عیسوی میں شعر و شاعری میں طبع آزمائی سے ہوئی نظر آتی ہے۔ شعر و شاعری کے ابتدائی دور میں للہ عارفہ کے علاوہ شیخ نور الدین ولی شامل ہیں۔ جب کہ بعد کے شعراء میں غنی کاشمیری، حبہ خاتون، محمود گامی (پ۔ ۱۷۶۵ء) اور غلام احمد مہجور (۱۸۸۸ء) کے نام مشہور ہیں۔ میر غلام احمد کشفی، کشمیری زبان کے ادب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فارسی رسم الخط کی ترویج کے بعد کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے عربی اور فارسی کی مذہبی کہانیوں، تاریخی واقعات، عشقیہ داستانوں اور اخلاقی نصائح کو کشمیری میں نظم کرنے کی طرف توجہ دی اور اس طرح کشمیری ادب میں معقول اضافہ ہوگیا۔''۵۳

یوں کشمیری ادب میں مجموعی طور پر لوک کہانیاں، لوک گیت، کشمیری شاعری، رزمیہ ادب، اور صحافت کے علاوہ تاریخ پر مستند تصانیف ملتی ہیں۔ صوتی اعتبار سے یہ زبان شینا، اردو، فارسی اور پنجابی سے کسی حد تک مماثل ہے۔۵۴

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ شمالی علاقہ جات میں مقیم کشمیری اقوام نے علم و ادب کے لیے اس زبان کا استعمال نہیں کیا۔ لہٰذا شمالی علاقوں میں یہ زبان صرف بولنے کی حد تک استعمال ہوئی۔ جن کشمیری حضرات نے ادب کی جانب رجوع کیا، انھوں نے اوّلاً فارسی اور پھر اردو ہی کو اختیار کیا۔ ان مصنفین میں عثمان علی، امان اللہ خان، خالد کشمیری اور جمشید دکھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام نے نثر کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے اور تحقیق و صحافت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

۹۔ گوجری:

شمالی علاقہ جات میں گوجروں سے مراد چرواہوں کی وہ اقوام لی جاتی ہیں، جو خانہ بدوش ہیں اور الگ تھلگ قیام پذیر ہیں۔ انھیں ''بکروال'' بھی کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صابر آفاقی کی تحقیق کے مطابق:

''گوجروں کے کچھ بکروال (خانہ بدوش) قبائل شام اور کردستان میں بھی ہیں جو گوجری سے ملتی جلتی زبان بولتے ہیں۔ شام کے لوگ انھیں ''کُجر'' (Kujar) کہتے ہیں۔''۵۵

غالباً انھی قبائل کے لوگ شمالی علاقہ جات میں خال خال موجود ہیں۔ جن کی مناسبت سے گوجر سے مراد ''بکروال'' لیے جاتے ہیں اور ان کی زبان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم یہ زبان گوجری ہی کی ایک قدرے مختلف شکل ہے۔ جو زبانِ علم و ادب سے کوسوں دور ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تحریری سرمایہ ملتا ہے، کیوں کہ یہ زبان ایک ہی گروہ تک محدود ہے۔ جب کہ وہ گوجری زبان جو مذکورہ زبان سے مختلف لہجے میں بولی جاتی ہے، زیادہ زرخیز ہے اور اس میں ادبی سرمایہ بھی ملتا ہے۔

اس گوجری زبان کا پس منظر قدیم ہے۔ گوجری کا لفظ ''گجرات'' سے اخذ کیا جاتا ہے، جو گوجروں کی نسبت سے گجرات کہلایا۔۵۶

گوجری کی قدیم شکل دکنی سے اس قدر ملتی ہے کہ مولوی عبدالحق کا خیال ہے:

''دکھنی اور گجری یا گجراتی دراصل وہی زبان ہے، جو دتی سے ان علاقوں میں پہنچی۔ البتہ اس میں مقامی الفاظ اور ترکیبیں بھی شامل ہوگئیں۔''۵۷

گوجری کی قدامت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صابر آفاقی نے درج ذیل مثال پیش کی ہے:

''وی گجرات کا گوجر تھا، جو بعد میں دکن چلا گیا۔ اس کی غزلیات کے بعض اشعار آج کی گوجری کے لگتے ہیں۔'' مثلاً

بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر *

---

* ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب کا یہ بیان شواہد سے ثابت نہیں ہوتا۔ مدیر

اس زبان کا رسم الخط اور حروف تہجی اُردو ہی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ زمانے کے ارتقا ۵۸ کے ضمن میں ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں۔

> ''انگریزوں کے آنے پر گوجروں نے ان کی مزاحمت کی تو انگریزوں نے گوجروں کو خوب ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ چناں چہ گوجروں کی اکثریت شکست کھا کر پہاڑوں میں چلی گئی اور اس کے بعد گوجری کا ارتقاء رک گیا۔'' ۵۹

البتہ انیسویں صدی میں گوجری زبان کے ادب کا احیاء شروع ہوا۔ اسی وقت سے یہ زبان مقبوضہ کشمیر اور آزاد جموں وکشمیر میں بولی اور لکھی جانے لگی۔ ادب کے حوالے سے بھی اس کا دامن وسیع ہے۔ آزاد جموں کشمیر ریڈیو سے اس کی باقاعدہ نشریات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ شعری اور نثری ادب میں بھی اس زبان کے قلم کار اور شعراء ادب طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اس زبان کے نام ور ادیبوں میں محمد اسماعیل ذبیح، اسرائیل مہجور، رانا فضل حسین، ڈاکٹر صابر آفاقی، مخلص وجدانی اور اقبال عظیم وغیرہ شامل ہیں۔

۱۰۔ کھوار:

کھوار زبان ''کھو'' قوم کی زبان ہے، جو چترال کے مختلف علاقوں میں آباد ہے۔ اس لیے اس زبان کو ''کھو'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی لکھتے ہیں:۔

> ''کھوار زبان اصل میں ''کھو'' اور ''وار'' کے الفاظ کا مرکب ہے۔ ''وار'' کا لفظ مقامی طور پر زبان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا کھوار کے معنی کھو قوم کی زبان ہے۔'' ۶۰

اس زبان کو شمالی علاقہ جات میں ''کھوار'' اور ''کھو'' کے علاوہ ''چترالی زبان'' بھی کہا جاتا ہے۔ کھوار زبان ان زبانوں میں شامل ہے، جو قیامِ پاکستان سے قبل بھی شمالی علاقہ جات میں موجود تھیں۔ "Language Hunting in the Karakorum" ''میں شینا، بروشسکی اور واخی کے علاوہ جس زبان کے بولے جانے کی شہادت ملتی ہے، وہ کھوار ہے۔'' ۶۱ ''کھوار زبان کے تحریری ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صرف تین سو سال پرانا ہے۔'' ۶۲ اس زبان کی کچھ مماثلت شینا زبان سے بھی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک یہ زبان رومن رسم الخط میں لکھی گئی اور ۱۹۲۱ء میں عربی رسم الخط کا

قاعدہ شایع کیا گیا۔ ۶۳ موجودہ صورتِ حال میں کھوار زبان کے ۵۲ حروفِ تہجی ہیں اور لکھنے کے لیے اردو رسم الخط اختیار کیا گیا ہے۔ کھوار کی ترقی اور فروغ کے لیے چترال میں باقاعدہ انجمنیں بنائی گئی ہیں اور تحقیقی کاموں پر توجہ دی جارہی ہے۔

پروفیسر اسرارالدین کے الفاظ میں:

> ''کھو اپنے تہذیب وتمدن اور دوسرے ادوارِ زندگی کے لحاظ سے اپنے جنوبی علاقوں کے پٹھانوں سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ قدیمی تعلق، یکساں تاریخ، رسم ورواج اور روایات کی ہم آہنگی کی بنا پر یہ لوگ گلگت ایجنسی کی مختلف وادیوں میں بسنے والے لوگوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔'' ۶۴

غالباً اسی مماثلت کی بنا پر کھوار زبان بولنے والے خاصی تعداد میں شمالی علاقہ جات میں موجود ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد شمالی علاقہ جات کے خطۂ گلگت میں کھوار شاعری میں کچھ پیش رفت دکھائی دیتی ہے۔ کھوار زبان میں مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں۔

۱۱۔ وخی:

وخی زبان کی قدامت کے بارے میں اب تک یقینی تعین نہیں ہوسکا، البتہ انگریزوں کے ایجنسی قائم کرنے کے زمانے (۱۸۷۷ء، ۱۸۸۹ء) میں یقیناً یہ زبان موجود تھی۔ کیوں کہ جن انگریزوں نے اس علاقے میں زبانوں کے متعلق تحقیق کی، انھوں نے شمالی علاقوں میں اس زبان کے بولے جانے کی تصدیق کی ہے۔ ۶۵ اس زبان کو ہندایرانی سلسلے کی بولی کہا جاتا ہے۔ ۶۶ اس زبان کے بولنے والے ''واخان'' کی پٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اسی نسبت سے اسے ''وخی'' یا ''واخی'' کہا جاتا ہے۔ شمالی علاقوں میں اسے ''گوجالی'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ واخان سے ہجرت کے نتیجے میں جو خاندان شمالی علاقوں میں آئے، ان کے ذریعے یہ زبان یہاں پہنچی اور بعد ازاں پھلنے پھولنے لگی۔

پہلی مرتبہ ۱۹۸۴ء میں حقیقت علی نامی ایک شخص کے ذریعے یورپین زبان میں وخی زبان کے حروفِ تہجی سامنے لائے گئے تھے۔ جو اردو دان طبقے کے لیے مشکل سمجھے گئے۔

لہٰذا ۲۰۰۰ء میں احمد جامی نجی نے اس زبان کا قاعدہ نئے سرے سے مرتّب کیا۔ جس کے مطابق اس زبان کے ۴۵ حروفِ تہجی مقرر کیے گئے۔ ۶۷ یہ زبان اردو رسم الخط میں تحریر کی جاتی ہے۔ اس زبان میں ادبی سرمایہ ناپید ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ زبان فارسی کے قریب ہے۔ اس زبان میں ایک سے دس تک ہندسے ملاحظہ فرمایئے۔

1۔یو	yeu	6۔ساد	sad
2۔بوئے	bui	7۔ہُوب	hub
3۔تروے	trui	8۔ھَت	hat
4۔ژبُور	tsebur	9۔نَو	naw
5۔پانز	panz	10۔ڈس	das

اب تک اس زبان میں محض خط و کتابت کی جاتی رہی ہے۔ اب حروفِ تہجی اور رسم الخط متعین ہونے کے بعد اس زبان کی ترقی کی امید کی جا رہی ہے۔

۱۲۔ ڈومکی:

''ڈومکی'' یا ''ڈوما کی'' زبان کے بارے میں اس سے قبل وضاحت کی گئی ہے، کہ یہ ایک قبیلے کی وضع کردہ زبان ہے، جس کو شمالی علاقوں میں آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس قبیلے کو ڈوم اور اسی نسبت سے ان کی زبان کو ''ڈومکی'' کہا جانے لگا۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ۶۸ خیال کیا جاتا ہے کہ مختلف اقوام سے ڈھول بجانے والوں نے ایک گاؤں آباد کر لیا اور یوں ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ اس خیال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس زبان میں شمالی علاقہ جات کی بہت سی زبانوں کے الفاظ مستعار لیے گئے ہیں۔ ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' میں علاقائی ادبیات کی ذیل میں اس زبان کو ''بریسکی'' (Beriski) کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ۶۹ اس زبان کی حیثیت محض بولی کی سی ہے، کیوں کہ اس میں ادب، حروفِ تہجی اور رسم الخط کچھ بھی اب تک واضح نہیں ہے۔

۱۸۹۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں ''ڈوم'' سے مراد میراثیوں کی ذات لی گئی ہے، یعنی گانے بجانے والے۔

وزیر قدرت اللہ بیگ اس ضمن میں مندرجہ ذیل رائے دیتے ہیں۔

"یہ ساز بجانے والے پیشہ وروں کی زبان ہے اور یہ لوگ ریاست کے صرف ایک ہی گاؤں میں آباد ہیں اور یہ زبان صرف گاؤں میں ہی بولی جاتی ہے۔"[۱۰]

وزیر قدرت اللہ بیگ نے اس زبان کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ان ساز بجانے والوں کے بزرگوں نے خود یہ زبان وضع کی تھی اور اب تک اس پیشے کے لوگ اسے اپنائے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خیال درست ہو، اس طرح اس پیشے کے لوگوں کو ہر قوم میں جا کر ساز بجانے کا موقع ملتا ہوگا۔ بہر حال یہ امر ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کی بنیاد کیسے پڑی۔ اس قوم کے افراد ساز بجانے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے، نہ ہی ان کو علم و ادب سے واسطہ ہے۔ لہٰذا اس زبان کو تحریر کے لیے تا حال استعمال نہیں کیا گیا۔

اس زبان کے ضمن میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ابتدا میں کسی ایک قوم کے گانے بجانے والے افراد نے کم تر خیال کیے جانے کے باعث الگ بستی بسالی۔ بعد ازاں دوسری زبانیں بولنے والی اقوام کے ہم پیشہ افراد بھی یہاں آ کر آباد ہوتے گئے۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف زبانیں بولنے والے یہاں آئے اور مشترک خصوصیات اور مشترک الفاظ کے استعمال سے ایک الگ بولی وجود میں آئی۔ جس کو آج ہم "ڈومکی" یعنی ڈوم قوم کی زبان کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ الگ سے کسی زبان سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ "ڈوم" قوم کی اپنی اختراع ہے۔

۱۳۔ کاشغری:[۱۱]

کاشغر کا علاقہ چین کے صوبہ سنکیانگ میں واقع ہے۔ سنکیانگ کے لفظی معنی "سرحدی علاقہ" کے ہیں۔ اس علاقے پر اولاً چنگیز خان کا قبضہ تھا۔ بعد ازاں کبلائی خان کا راج رہا۔ "تیرھویں صدی عیسویں میں تیمور لنگ نے سنکیانگ کو تاراج کر دیا۔[۱۲] لیکن اٹھارہویں صدی میں چینیوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔

سنکیانگ میں ازبک، ترکمان، تاتار، جلدیر، قزاق، کرغز اور ترک اقوام بستی ہیں۔ ترک اقوام کو "اُوی غور" کہا جاتا ہے۔ یہ سنکیانگ کی آبادی کا پچھتر فی صد ہیں۔ صوبہ

سنکیانگ کے مشہور شہروں میں ارمچی، کاشغر، یارقند، آکسو، کلاجہ ہیں۔ یہ اول الذکر تینوں شہر شمالی علاقہ جات اور چین کی سرحد سے قریب ترین واقع ہیں اور ان کی زبان مشترک ہے۔ ان کی نسبت سے کاشغر سے آئے ہوئے لوگوں کی زبان کو کاشغری کہا جاتا ہے۔ جب کہ اصل میں اس زبان کا نام ''(وَیغور)، (اویغور)'' ہے، اس زبان کے حروفِ تہجی ابتدا میں لاطینی زبان سے اخذ کیے گئے۔ بعد میں عربی رسم الخط اپنایا گیا اور (۳۲) بتیس حروفِ تہجی متعین کیے گئے۔۳ے

اس زبان کے حروف تہجی متعین کرتے ہوئے یہ اصول وضع کیا گیا کہ محض ضروری حروف پر اکتفا کیا جائے اور غیر ضروری حروف کو استعمال نہ کیا جائے۔ مثلاً ''ز، ض، ظ، ذ'' میں سے ''ز'' کو اختیار کیا گیا اور بقیہ کو غیر ضروری قرار دیا گیا۔ یہی صورتِ حال ''ت، ٹ اور ط'' کی صورت میں اختیار کی گئی اور محض ''ت'' کو استعمال کیا گیا۔ ''ت'' کو ''ٹ'' کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا اس زبان میں آوازوں کی ضرورت کے تحت حروف کو استعمال کیا جاتا ہے۔

پہلی مرتبہ محمود کاشغری نامی ایک مصنف نے ''ایغور'' حروفِ تہجی متعین کیے۔۴ے جس میں بعد ازاں ترمیم کر کے مزید مختصر کیے گئے۔ ترکی رسم الخط کو ترک کر کے عربی رسم الخط کو اختیار کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر سمجھا جاتا ہے۔

شمالی علاقہ جات میں کاشغر اور یارقند سے آئے ہوئے ترک النسل لوگوں کو ''کاشغری'' ہی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عقیدے کے اعتبار سے اہلِ سنت حنفی ہیں۔ کاشغر، یارقند اور شمالی علاقہ جات کے مابین روابط زمانہ قدیم سے قائم ہیں۔ تجارتی، لسانی اور معاشرتی روابط کے اعتبار سے دونوں کے مراسم بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ یوسف حسین آبادی قدیم زمانے میں ان دونوں علاقوں کے مابین روابط کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''قدیم زمانے میں بلتستان کا یارقند، کاشغر، لداخ، نوبراہ، تبت، کشمیر اور ہندوستان کے علاقوں کے ساتھ تجارتی لین دین قائم تھا۔۔۔۔ یارقند سے قالین، نمدے، سمادار اور دریچے اور کاشغر سے چوغے درآمد ہوتے تھے۔ یارقند سے اچھی نسل کے گھوڑے بھی لائے جاتے تھے۔''۵ے

غالباً قدیم زمانے میں تجارت کی غرض سے آنے والوں نے ان علاقوں میں رہائش بھی اختیار کی ۔ اس لیے کہ قدیم زمانے سے بلتستان کے علاقے شگر میں یارقند کے نام موسوم خوبانی کے درختوں کی قسم چلی آرہی ہے۔ لیکن اس کی وجہ تسمیہ کسی کو معلوم نہیں۔ خیال ہے کہ یہ انہی قدیم مراسم کے نتیجے میں بوئے گئے درخت ہوں گے۔ تاہم قیامِ پاکستان کے بعد مراسم مزید بڑھے۔ قیام پاکستان کے بعد تجارت کی غرض سے کاشغر سے کچھ افراد گلگت کے خطے میں پہنچے۔ ان میں سے بعض افراد نے یہاں مستقلاً رہائش اختیار کرلی۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ کاشغریوں، گلگتیوں، پٹھانوں اور کشمیریوں کے مابین شادیاں ہوتی ہیں اور یہ اقوام تیزی سے شمالی علاقوں میں اپنی جگہ بنارہی ہیں۔

ریڈیو اسٹیشن اُرمچی (چین) سے ''ایغور'' زبان میں باقاعدہ نشریات گلگت میں سُنی جاتی ہے۔ اس زبان کے ادب میں صحافت، لوک کہانیاں، افسانے، ناول، ڈراما، گیت، غزل، نظم یعنی تقریباً تمام اصناف لکھی جاتی ہیں۔ گلگت لائبریری میں ''بوستان'' کا ترجمہ اس زبان میں موجود ہے۔ ماضی میں کراچی سے اعظم ہاشمی ''ازبکستان'' کے نام سے ماہ وار مجلہ نکالتے تھے (جس کے سن کا یقینی طور پر تعین نہیں کیا جاسکتا) اس مجلّے کا ایک صفحہ ''ازبک زبان'' میں اور ایک صفحہ اردو ترجمے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اعظم ہاشمی اردو ڈائجسٹ، لاہور میں بھی اردو زبان میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ حسن آفندی نامی ایک بزرگ بھی اردو زبان میں اپنی یادداشتیں مرتب کررہے ہیں۔ یوں یہ قوم بھی اردو زبان و ادب کے قریب آتی جارہی ہے۔

۱۴۔ ہندکو:

''ہندکو زبان، کوہستان سندھ کے زیریں علاقے مانسہرہ، ایبٹ آباد، ہری پوری، تربیلہ، غازی، کوہاٹ اور ان کے نواحی علاقوں میں کُلی طور پر اور نوشہرہ، پشاور اور دیگر علاقوں میں جزوی طور پر بولی جاتی ہے۔'' ۶ے اس کی قدامت کے متعلق تحقیق جاری ہے۔ ہندکو زبان کے حروفِ تہجی اردو اور پنجابی سے مماثل ہیں۔ یہ زبان اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ شمالی علاقہ جات میں ہندکو بولنے والوں کی آمد قیامِ پاکستان کے بعد باقاعدہ شروع ہوئی۔ ابتدا میں انتظامی معاملات کے لیے ہندکو بولنے والے افراد مقیم رہے۔ اب بھی

سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ان علاقوں میں چند لوگ موجود ہیں ۔ کثیر تعداد میں ہندکو بولنے والے بیکری، سبزی اور پھل وغیرہ کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ تاہم شمالی علاقوں میں ان لوگوں کا ہندکو ادب سے واسطہ نہیں ہے۔ پڑھے لکھے افراد بھی تصنیف و تالیف کے لیے اردو ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ ہندکو زبان سے تعلق رکھنے والے شاعر ہارون الرشید کا مجموعۂ کلام ''بوندیں'' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔۷۷

۱۵۔ انگریزی:۷۸

انگریزی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنا الگ رسم الخط اور ادبی سرمایہ رکھتی ہے۔ شمالی علاقہ جات میں یہ زبان باقاعدہ ۱۸۷۷ء، میں داخل ہوئی، جب کرنل جان بڈلف کی زیرِ نگرانی چار سال تک گلگت ایجنسی قائم رہی۔ اس سے قبل اِکا دُکا انگریز سیّاحوں کے سراغ ملتے ہیں، مگر انگریزی زبان سے نابلد مقامی عوام سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایجنسی قائم ہونے پر انگریز افسران شمالی علاقوں میں دیر تک مقیم رہے اور اس زبان کا عمل دخل ہونے لگا۔ جو انگریز افسران گلگت ایجنسی میں نگران بنے۔ انھوں نے اس علاقے کے بارے میں کتابیں تصنیف کیں اور اس علاقے کی زبانوں پر تحقیق کی۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ انگریزی کو اس لحاظ سے بھی اولیت حاصل ہے کہ شمالی علاقوں میں ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ گلگت میں مقیم انگریز اہلکاروں نے "Spancular" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا ۷۹ جو شمالی علاقہ جات میں صحافت کی ابتدا سمجھی جاتی ہے۔ بعد ازاں مختلف مقامی زبانوں کی گرائمر پر تحقیقی کاموں کی ابتدا بھی انگریزوں نے کی۔ مقامی لوک داستانوں اور گیتوں کے تراجم بھی ہوئے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالواسطہ طور پر شمالی علاقہ جات میں انگریزی کا عمل دخل گہرا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تصنیفات میں سے اکثر کی پذیرائی ملک سے زیادہ، ملک سے باہر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کے بارے میں حقائق تحریری حالت میں بہت کم تعداد میں موجود ہیں۔ اب ان تصانیف کے اردو زبان میں تراجم کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کوشش شیر باز علی برچہ نے کی ہے۔۸۰

شمالی علاقہ جات کے لوگ بھی انگریزی زبان میں طبع آزمائی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ وزیر محمد اشرف ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ ایک کتاب تصنیف کر چکے ہیں۔ اس وقت ایک ہفت روزہ اخبار Karakuram کے نام سے جاری ہو چکا ہے۔ اسکول اور کالجوں کے مجلوں میں انگریزی کا حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ مستقبل قریب میں اس زبان میں نظم و نثر میں ترقی کا امکان ہے۔

الغرض شمالی علاقہ جات میں مجموعی طور پر پندرہ زبانیں بولی جاتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض زبانوں کی قدامت ہزاروں سال کو محیط ہے۔ ان زبانوں میں بیشتر میں ادب بھی تخلیق کیا جاتا ہے۔ مقامی و غیر مقامی زبانوں کے ضمن میں ان کے نام ور ادباء و شعرا کا مختصر تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز سے قبل مقامی زبانوں کے ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کیا جا سکے کہ اردو زبان نے ان زبانوں کے مابین اپنی راہ کیسے بنائی اور ان زبانوں پر اردو کے آنے سے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ درج بالا تفصیلی جائزے سے ہم درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

۱۔ شمالی علاقہ جات میں موجودہ پندرہ زبانوں کی موجودگی میں بھی رابطے کے لیے ایک ہمہ گیر زبان کی ضرورت موجود تھی۔ لہٰذا اسے فوراً اپنا لیا گیا۔

۲۔ مقامی زبانوں میں سے ہر ایک کے رسم الخط اور قواعد نامانوس تھے، جو محض ایک قبیلے تک محدود تھے۔ دوسری اقوام سے مقامی زبانوں میں رابطہ کرنا ممکن نہ تھا۔

۳۔ اردو زبان کے ذریعے مقامی زبانوں کو رسم الخط میسر آیا۔ جس کے بعد ان زبانوں کے ادب نے ترقی کی۔

۴۔ ادب میں ترقی کے باعث بیشتر اقوام نے اپنے تہذیب و تمدن کو ان علاقوں سے باہر بھی منوایا، جو اس سے قبل ممکن نہ تھا۔

۵۔ مقامی زبانوں میں اردو رسم الخط اور حروف تہجی در آنے کے بعد موضوعات میں بھی اضافہ ہوا، جس سے مقامی ادب میں ادیبوں اور شاعروں کو مدد ملی۔

۶۔ اردو زبان کی بدولت ان زبانوں کے ادباء و شعرا کو اپنے خیالات کی وضاحت کا موقع ملا۔

شمالی علاقہ جات میں موجود پندرہ زبانوں کے ادب کا جائزہ لینے کے بعد اب اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ اردو ان علاقوں میں کیسے داخل ہوئی اور کیوں کر اپنی جگہ بنانے میں کام یاب ہوئی؟ اس بحث کا آغاز اسلام کی آمد کے بعد کے حالات کے عمیق جائزے سے کیا جانا چاہیے۔

(۲)

شمالی علاقہ جات میں اردو زبان کا آغاز

اسلام کی آمد سے قبل یہاں بدھ مت رائج تھا اور سنسکرت زبان عام تھی۔ (۱۳۷۳ء) میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی ایرانی مبلغین کی آمد ہوئی اور عربی، فارسی تعلیمات عام ہوئیں۔ ان زبانوں نے سنسکرت کے اثر کو یک سر مٹا دیا۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، جس کے باعث بیشتر عربی الفاظ مقامی بولیوں میں دخیل ہوئے۔ ان میں سے بہت سے الفاظ فارسی اور عربی میں یکساں استعمال ہوتے تھے، جیسا کہ شینا زبان پر اسلام کے اثر کا جائزہ لیتے ہوئے وزیر محمد اشرف نے گلگت میں اسلام کے ورود کے بعد اس کے اثرات کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''بودھی اور سنسکرت رسم الخط کی بجائے فارسی رسم الخط کا رواج ہوا۔ عربی اور فارسی الفاظ شینا زبان میں داخل ہوئے۔ مثلاً اللہ، رسول ﷺ، خدا، حُور، فرشتہ، جنت، کافر، دوزخ، قرآن، مسافر، افطار، روزہ، وضو، قبلہ، زیارت، گلاب، شراب، قلم کاغذ، فجر، نوروز، عید، تکبیر، باغ، نگار، سنسار اور رُباب وغیرہ۔''۸۱

اشاعتِ اسلام نے شمالی علاقہ جات کے لوگوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ نہ صرف الفاظ بلکہ علمی، ادبی موضوعات اور اصنافِ سخن تک تبدیل ہو گئے۔ تمام تر شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی رنگ نظر آنے لگا۔ گلگت کے ساتھ ساتھ بلتستان میں بھی بعینہٖ یہی صورت حال تھی۔ رسم الخط کے علاوہ طرزِ بودوباش میں بھی تبدیلی آنے لگی اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں مذہب کے زیرِ اثر تبدیلی کو قبول کیا جانے لگا۔ اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے نادرہ زیدی ان خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

> '' ایرانی اثر کے تحت بلتستان کے شعراء نے فارسی زبان میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ عربی زبان مذہبی تعلیم کے لیے مخصوص تھی۔۔۔ آہستہ آہستہ بلتی زبان اور شاعری میں فارسی کے الفاظ بہت استعمال ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ فارسی اور بلتی کی آمیزش سے بعد کی زبان نے رواج پایا۔''۸۲

یہی صورتِ حال شمالی علاقہ جات کی بقیہ زبانوں میں بھی نظر آنے لگی۔ مذہب کے ساتھ ساتھ زبانوں کا سانچہ بھی بدلنے لگا۔ ان زبانوں میں بلتی اور شینا کے ساتھ ساتھ بروشسکی اور واخی بھی شامل ہیں۔ جن جن خطوں میں اسلام پھیلتا گیا۔ فارسی رسم الخط رائج ہوتا گیا اور زبانیں عربی و فارسی سے مانوس ہوتی چلی گئیں۔ پروفیسر عثمان علی اس صورتِ حال کا یوں تجزیہ کرتے ہیں:

> ''شینا، بروشسکی، بلتی اور واخی میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی۔ جو ان زبانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اسلام کی تبلیغ عربی، فارسی کے توسط سے ہوتی۔ اولیاء، علماء اور واعظوں نے جتنے الفاظ استعمال کیے۔ ان کی وجہ سے یہ چند زبانیں ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ نماز، اذان، وضو، قبلہ، کعبہ، اللہ، صلوٰۃ، روزہ، اسلامی مہینے، دن، قمری سال، اخلاقیات غرض یہ زبانیں اس علمی اور ثقافتی سیلاب میں بہہ گئیں۔ اور ایک ساتھ کنارے لگیں۔ فارسی خطِ نستعلیق سب کے ہاتھ آیا۔''۸۴

بہ ظاہر یہ ایک مذہبی پس منظر ہے، لیکن اصل میں اس نے اردو کے لیے راہ ہموار کی۔ وہ الفاظ جو فارسی، عربی میں مشترک ہیں اور وہ موضوعات جو اسلام سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے چودھویں صدی عیسوی سے اسلام کے ساتھ ان علاقوں میں جگہ بنانا شروع کردی اور عوام ان سے مانوس ہونے لگے۔ چودھویں صدی عیسوی میں مبلغ شمالی علاقہ جات میں آئے، ان کی تصنیفات سے اس صورتِ حال کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۱۳۸۳ء میں سیّد علی ہمدانی کی تصنیف ''المودۃ القربیٰ'' میں عربی اور فارسی رسم الخط کا استعمال ہے۔ اس کے مندرجات میں اللہ، رسول ﷺ، نماز، وضو، قرآن، اذان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

اسی دوران سیّد محمد نوربخش (۱۳۹۳ء - ۱۴۶۴ء) کی بذریعہ کشمیر، بلتستان آمد ہوئی۔ جس کے دوران مندرجہ بالا صورتِ حال مذہبی تصانیف پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اُس زمانے کی تصنیف کردہ کتاب ''منظوم فقہ الاحوط'' کے فارسی اور عربی مندرجات میں درج ذیل اردو الفاظ ملتے ہیں جو آج بھی بعینہٖ اسی شکل میں استعمال ہوتے ہیں۔

> ''بہترین، دعوت، شریعت، نظم، فیض، شرکت، نیت، استعمال، وقت، نماز، صبح، دائرہ جماعت، روزہ، شراب، دنیا، یوم، جنت، وضو، مشرکین، اللہ، محمد ﷺ، اللہ اکبر، رب، روح، دعا، تکبیر۔''۸۵

یہ صورتِ حال پندرھویں صدی تک چلتی رہی حتیٰ کہ فارسی پورے کشمیر کی زبان بن گئی۔ سولہویں صدی عیسوی (۱۵۸۶ء) میں اکبر نے کشمیر کو مغلیہ سلطنت میں شامل کیا تو دارالحکومت موسمِ سرما میں جموں اور موسم گرما میں لداخ کو مقرر کیا۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جموں میں ڈوگری زبان اور لداخ میں تبتی (بلتی) زبان رائج تھی جب کہ بادشاہ کی زبان فارسی تھی۔ بادشاہ کے ساتھ اس کی بیگمات اور اہلِ خانہ کا سیر و تفریح کے لیے آنا جانا بھی کتبِ تاریخ سے ثابت ہے۔ ۸۶ یہی وہ زمانہ ہے جب فارسی، ڈوگری اور تبتی زبانوں میں لسانی تغیرات ہونے لگے۔ تبتی چوں کہ نامانوس رسم الخط اور لب و لہجہ رکھتی تھی، لہٰذا فارسی اور ڈوگری زبانوں کے مشترکہ الفاظ تبتی یعنی مروّجہ بلتی زبان پر اثر انداز ہوئے۔ مثلاً مسجد اور خانقاہ کا لفظ تینوں زبانوں میں یکساں طور پر مستعمل رہا۔ قدیم زمانے سے ہی پندرہ بیس میل کے فاصلے پر ہر بڑے گاؤں کو ''پڑاؤ'' کہا جاتا تھا۔ ۸۷ جموں سے قربت کی بنا پر یہی رجحان بلتستان کے علاقوں میں بھی در آیا۔ زبانوں کا یہی تغیر علاقوں کے ناموں پر اثر انداز ہوا، مثلاً زمانۂ قدیم سے علاقوں کے نام براہِ پائین، براہِ بالا یا گانگ چھے پائین، اور گانگ چھے بالا کی طرز پر پکارے جاتے رہے ہیں۔ ۸۸

عہدِ اکبری سے سترہویں صدی تک کم و بیش یہی صورتِ حال رہی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانوں کا کشمیر پر قبضہ ہو گیا۔ فارسی بدستور اس علاقے میں پھلتی پھولتی رہی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے صورتِ حال میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور سکھوں کا عمل دخل ان علاقوں میں شروع ہو گیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے اُنیسویں صدی کے آغاز ہی میں ان علاقوں میں پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے ابتدائی حالات سے بخوبی علم ہوتا ہے کہ کشمیر ۱۸۱۰ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار میں شامل ہوا۔ جبکہ اس وقت پنجاب کی حدود میں پشاور ڈیرہ جات، ہزارہ، کشمیر، تبت، لدّاخ، جموں، کانگڑہ، منڈی، سکیت، کلو، بہاولپور اور کوہِ سلیمان کے علاقے بھی شامل تھے۔ ۸۹ مہاراجا رنجیت سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر پر قبضہ ۱۸۱۹ء میں کیا۔ اُس وقت یہ ریاست سکھوں کے ماتحت ایک صوبہ تھی اور اس صوبے کا حاکم دربارِ لاہور کے ماتحت تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی افواج میں مختلف زبانیں بولنے والے شامل تھے۔ ان میں پنجابی، پشتو، ہندکو بولنے والوں کے علاوہ رام پوری پٹھان شامل تھے۔ لیکن پنجابی بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ اس کے دربار میں سکھ قوم کو غلبہ حاصل تھا۔ نریندر سنگھ سنہا ۱۸۱۳ء میں رنجیت سنگھ کے دربار کی صورتِ حال کو ریکارڈ کی مدد سے یوں بیان کرتے ہیں:

> ''۱۸۱۳ء میں تنخواہ کی فردوں سے پتا چلتا ہے کہ اس باقاعدہ فوج کا بیشتر حصہ ہندوستانی گورکھا اور افغانوں پر مشتمل تھا۔ لیکن ۱۸۱۸ء کی فردوں سے ظاہر ہے کہ فوج میں پنجابی عنصر عروج پر تھا۔ حالاں کہ رنجیت سنگھ سب فرقوں میں سے سپاہی بھرتی کرتا تھا۔ پھر بھی اکثریت ہمیشہ سکھوں کی رہی۔''۹۰

اس جائزے سے ایک اور قابلِ ذکر نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ رنجیت سنگھ پنجابی ہونے کے باوجود دیگر زبان بولنے والوں کو بھی حکومتی ضرورت کے تحت ہمیشہ شامل رکھتا تھا۔ لیکن سکھوں کے اکثریت میں ہونے کی وجہ سے پنجابی زبان و ادب کو بھی راجا کے دور میں عروج حاصل ہوا۔ اسی لیے حمید اللہ ہاشمی نے اس کے عرصۂ حکومت کو بدنظمی اور انتشار کے باوجود ''پنجابی ادب کا زرّیں دور'' قرار دیا ہے۔ ۹۱ یہاں تک کہ اس دور میں پنجابی زبان نے دفتری زبان تک پہنچنے کے تمام مراحل طے کر لیے تھے، لیکن مسلمانوں اور سکھوں کے رسم الخط الگ الگ ہونے کے باعث پنجابی سرکاری زبان کا درجہ نہیں پا سکی۔ حمید اللہ ہاشمی کے مطابق:

> ''سکھی دور میں غور کیا گیا کہ دفتری زبان فارسی کے بجائے پنجابی ہونی چاہیے۔ لیکن مسلمانوں اور سکھوں کے الگ الگ رسم الخط ہونے کی وجہ سے پنجابی زبان دفتری زبان نہ بن سکی اور فارسی ہی دفتری زبان رہی۔''۹۲

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ سکھوں اور ان کی بدولت پنجابی زبان کا غلبہ ہونے کے باوجود صرف اس وجہ سے پنجابی سرکاری زبان نہیں بن سکی کہ اس کے دربار میں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ جو یقیناً حکومتی امور میں کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کی وجہ سے مہاراجا رنجیت سنگھ فارسی زبان پر اردو زبان کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ لاہور دربار میں اردو اس وقت تک ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے آباؤ اجداد بھی اردو سے بے بہرہ نہ تھے، بلکہ اس سے قبل پنجاب میں اردو زبان شاعری کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔ رنجیت سنگھ کے دادا چڑت سنگھ کے ۹۳ انتقال پر ۱۷۷۵ء میں نامدار خان دت ۹۴ نامی شاعر نے اردو زبان میں اس کا مرثیہ تحریر کیا، جس میں شستہ اردو زبان کا استعمال نظر آتا ہے:

افسوس ہے جہاں کے ثبات اور قرار پر
اس باغِ بے وفا کی خزاں اور بہار پر
اس پیرراں عروس نما کے نگار پر
دو دن کی زندگانیِ ناپائیدار پر
دل بستگی نہ کر دمِ بے اعتبار پر
احوال چڑت سنگھ کا لکھتا ہوں فی المثل ۹۵

اس پسِ منظر کے بعد اب ہم جب ۱۸۱۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار میں اردو زبان کا جائزہ لیتے ہیں، تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ لاہور دربار کے اثر کی وجہ سے ریاست جموں و کشمیر میں بھی اردو زبان مہاراجا کے دربار میں بھی اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار سنبھالنے کے بعد اگرچہ سرکاری طور پر فارسی کا استعمال رہا، لیکن فارسی سے کامل بہرہ مند نہ ہونے کے باعث اردو زبان اس کے دربار میں عام بول چال کے لیے رائج تھی۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر، ''بیاضِ یکدلؔ''، شمارہ نمبر ۱۳ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مؤرخین نے لکھا ہے کہ مہاراجا اپنے درباریوں اور بے تکلف افراد کے ساتھ پنجابی اور مسلمان ایلچیوں، سیاسی شخصیتوں اور اجنبیوں کے ساتھ اردو میں بات چیت کرتا تھا۔'' ۹۶

یہی رجحان مہاراجا کے دربار میں مستقلاً نظر آتا ہے۔ فارسی زبان سے مہاراجا قطعی نابلد ہرگز نہ تھا۔ وہ سرکاری فرامین کا جواب فارسی میں تحریر کرواتا۔ تاہم اردو زبان اس کی ذاتی پسند کے طور پر استعمال میں رہی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ اپنے لیے ''سرکار'' کا لقب اختیار کرتا اور اس نے سرکاری مہر پر بھی ''خدا رنجیت کا مددگار'' کے الفاظ کندہ کرائے تھے۔ جس کی بابت نریندر کرشن سنہا، مہاراجا رنجیت سنگھ کی سوانح حیات میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''اپنی حکومت کے لیے وہ ''خالصہ جی'' یا ''خالصہ سرکار'' کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ انہی مہروں پر بھی اس نے ''خدا رنجیت کا مددگار'' کندہ کرایا تھا۔'' ۹۷

اردو زبان و ادب کی قابلِ ذکر روایت کے ساتھ مہاراجا رنجیت سنگھ کشمیر پر ۱۸۱۹ء میں قابض ہوا۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ جب اوّل اوّل اس نے یہاں دربار کیا تو درباری اور دفتری زبان غیر اعلانیہ طور پر اردو ہوگی۔ اس لیے کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں اُس دور میں اردو کے ارتقا کا سفر جاری و ساری تھا۔

۱۸۱۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے کشمیر پر قبضے کے صرف تین سال بعد ۱۸۲۲ء میں مہاراجا گلاب سنگھ کو جموں کا علاقہ بخش دیا گیا۔ جہاں وہ مہاراجا رنجیت سنگھ کی افواج سمیت حکمران ہوا۔ جموں پر پہلے سے ڈوگری زبان کا راج تھا۔ ۱۸۲۲ء میں گلاب سنگھ کے قبضے کے ساتھ ہی اردو کا ایک واضح مستقبل نظر آنے لگا۔ دربارِ جموں میں اردو کی موجودگی کے ضمن میں جی۔ ایم میرؔ ایک مضبوط شہادت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

> ''مہاراجا گلاب سنگھ کے خاص باڈی گارڈ رام پور کے رہنے والے روھیلہ پٹھان تھے جو اردو بولتے تھے اور شہر کے لوگوں سے اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔''۹۸

مہاراجا گلاب سنگھ کے دربار میں فریادیوں کے لیے بھی اردو زبان ہی مخصوص تھی۔ اردو کی ترویج کے بارے میں مسٹر فریڈرک ڈریو اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں۔:

> ''وہ محل میں ہو، دربار میں یا باہر، اس کے پاس پہنچنے کے لیے یہ دستور تھا کہ فریادی ہاتھ میں روپیہ لے کر پکارتا تھا۔ مہاراج عرض ہے۔''۹۹

جموں پر قبضے کے ساتھ ہی مہاراجا گلاب سنگھ نے گردونواح کے پہاڑی علاقوں، جن میں شمالی علاقہ جات بھی شامل تھے، پر قبضے کے لیے مہمات تیز تر کر دیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کشمیر پر قبضے کے بعد واپس آ کر پنجاب میں فتوحات میں مصروف ہوگیا۔ دریں اثنا رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے مابین اختلافات پیدا ہونے لگے۔ جس کی بڑی وجہ اپنی مسلسل فتوحات کے باعث راجا رنجیت سنگھ کی انگریزوں کے سامنے ایک حریف کی سی حیثیت تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی توجہ کشمیر اور گردونواح سے ہٹتے ہی مہاراجا گلاب سنگھ اور اس کے بھائیوں نے جموں اور متصل شمالی علاقوں میں اپنی حیثیت مستحکم کرنا شروع کر دی۔ اب مہاراجا گلاب سنگھ کے شمالی علاقوں پر قبضے کے سلسلے میں مہمات تیز ہوتی چلیں گئیں۔ اس دور میں بھی مہاراجا کی افواج میں اردو رابطے کی زبان کے طور پر مستعمل تھی۔ شیر باز علی برچہ کا بیان بھی اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مہاراجا کی فوج میں بھارت کی بولیوں والے سپاہی شامل تھے۔ ڈوگری، کشمیری، پنجابی، پشتو اور ہندکو بولنے والے سپاہی کثرت سے تھے، مگر ان میں رابطے کی زبان اردو تھی۔''[۱۰۰]

کچھ ہی عرصے میں مہاراجا گلاب سنگھ نے شمالی علاقوں کے بعض حصّوں پر اپنا قبضہ مضبوط کرلیا۔ ۱۸۳۴ء میں مہاراجا نے لیہہ پر اور ۱۸۴۰ء میں بلتستان پر قبضہ کرلیا۔ جیسا کہ نریندر کرشن سنہا بیان کرتے ہیں:

''عملی طور پر ان جموں برادران (گلاب سنگھ اور اس کے بھائی مراد ہیں) نے پہاڑی علاقوں میں اپنی پوزیشن بہت مستحکم بنا رکھی تھی۔ مہاراجا (رنجیت سنگھ) کے انتقال کے بعد غالباً جموں و دیگر پہاڑی علاقوں پر اپنی مطلق العنان حکومت قائم کرنے کی امید رکھتے تھے۔''[۱۰۱]

مہاراجا کی افواج کے ہمراہ جب اردو زبان ان متفرق علاقوں میں پہنچی تو یہ مقامی زبانوں سے اتنی مختلف تھی کہ یہاں کے لوگوں نے اسے ''نادر زبان'' کا نام دیا۔ عوام کی اسی دلچسپی نے بعد ازاں اسے شرفِ قبولیت بخشا۔ ''نادر زبان'' کا لفظ بہت کم عرصہ عوام کے استعمال میں رہا اور جلد ہی اسے مہاراجا کی افواج کی مناسبت سے سپاہیوں کی زبان [۱۰۲] کا نام دے دیا گیا۔

مہاراجا گلاب سنگھ کی افواج اوّلاً ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ بلتستان کے علاقوں میں داخل ہوئیں، جہاں ابتدا میں اردو کو ''سپاہیوں کی زبان'' کا نام دیا گیا۔ بعد میں اسی روایت نے گلگت کے خطّے میں پہنچ کر ''سُپیا'' کا نام پایا۔ شیر باز علی برچہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''مقامی لوگ ان بولیوں خصوصاً پنجابی اور اُردو کو سُپیا کہتے تھے۔ یعنی سپاہیوں کی زبان۔''[۱۰۳]

اس موقع پر وہ یہ اطلاع بھی فراہم کرتے ہیں کہ:

''سپاہیوں اور دیگر سرکاری اہل کاروں کی ضرورت کے پیشِ نظر گلگت کے مرکزی حصّے میں بازار بھی وجود میں آیا...[۱۰۴]

یقیناً اس بازار نے بھی اردو زبان کے پھیلاؤ میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا ہوگا۔ یوں بلتستان کے بعد گلگت میں بھی اس زبان نے سپاہیوں کی مناسبت سے سُپیا کا نام پایا اور کچھ عرصہ یہی نام رائج رہا۔

ڈوگرہ ادوار (۱۸۴۰ سے قبل) میں شمالی علاقہ جات کے جو افراد ہندوستان کا سفر اختیار کرتے، وہ ''اردو زبان'' کا شعور اپنے ہمراہ ان علاقوں میں لایا کرتے تھے۔ یوں شمالی علاقوں کے خطے بلتستان میں یہ زبان ''ہندوستانی زبان'' کے نام سے بھی متعارف ہوئی۔

اس موقع پر اردو زبان اپنا مقام اس حد تک متعین کر چکی تھی کہ بلتستان پر قبضے کے بعد اسے سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا گیا۔ اس تاریخی واقعے کی شہادت شمیم بلتستانی کے اس بیان سے ملتی ہے کہ:

> ''۱۸۴۰ء میں سقوطِ بلتستان کے بعد جب ڈوگروں کا تسلط ہوا تو ڈوگروں نے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا۔''[۱۰۵]

اس موقع پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ نفاذِ اردو کی یہ صورتِ حال صرف بلتستان سے تعلق رکھتی ہے۔ گلگت پر قبضہ ۱۸۴۶ء میں اُس وقت مکمل ہوا، جب گلگت کے خطے میں ڈوگرہ افواج قابض ہوئیں تو یہاں پر مہاراجا گلاب سنگھ نے سرکاری سطح پر اردو کے نفاذ کو مقدم رکھا۔ شمالی علاقہ جات میں اردو کے آغاز کے ضمن میں سیّد عالم اپنی کتاب ''شمالی علاقہ جات میں اردو''، میں ان علاقوں میں اردو کے آغاز کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ڈوگرہ افواج کا مرہونِ منت قرار دیتے ہیں۔ اُس زمانے میں بھی ڈوگرہ راجا انگریز حکومت کے وفادار ہوا کرتے تھے۔ ان وفاداریوں کے ثبوت میں انھوں نے انگریزوں کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مدد کے لیے اپنی افواج بھارت روانہ کی تھیں۔ درحقیقت سیّد عالم کو حبیب کیفوی کے درج ذیل بیان سے مغالطہ ہوا ہے، جس میں انھوں نے کشمیر میں اردو کے پھیلاؤ کے ضمن میں ڈوگرہ افواج کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> ''جنگِ آزادی ختم ہونے کے باوجود ڈوگرہ فوجیں کچھ عرصہ دہلی میں مقیم رہیں اور جب ریاست میں واپس آئیں تو اپنے ساتھ اردو کے بے شمار الفاظ بھی لائیں۔ جس سے ریاست میں اردو کے رائج ہونے میں بڑی مدد ملی۔''[۱۰۶]

سیّد عالم نے اسی قسم کے بیان میں خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ڈوگرہ افواج شمالی علاقہ جات میں پہلی بار اردو کے الفاظ لے کر آئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ فوجیں جب واپس آئیں تو اردو کے بہت سے الفاظ بھی ساتھ لائیں۔ جس کے ذریعے کشمیر میں اردو کو فروغ ملا۔ اُس دور میں ڈوگری، گوجری اور پنجابی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس لیے یہاں پر اردو بولنے میں آسانی پیدا ہوگئی۔ اہلِ کشمیر نے بھی آہستہ آہستہ اردو کو اپنا لیا۔ اس طرح گلگت بلتستان میں بھی اردو ڈوگرہ دور میں شروع ہوئی۔"[۱۰۷]

سیّد عالم کے مذکورہ بیان سے سب سے پہلے تو یہ ابہام سامنے آتا ہے کہ اردو شمالی علاقوں میں ۱۸۵۷ء کے بعد متعارف ہوئی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو ۱۸۵۷ء سے قبل شمالی علاقوں کے بعض حصّوں مثلاً گلگت اور بلتستان میں سرکاری زبان کے طور پر رائج ہو چکی تھی، جس کی متعدد کتب اور تاریخ شمالی علاقہ جات میں شہادتیں ملتی ہیں۔ لہٰذا ڈوگرہ افواج کو اس کے متعارف کرانے کا ذمّے دار ٹھہرانا گمراہ کن ہے۔ البتہ سیّد عالم کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ڈوگرہ افواج جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان سے واپس آئیں تو اردو سے ان کی واقفیت کی وجہ سے یہاں اردو کے پھیلاؤ کو تقویت حاصل ہوئی۔ اردو کے پھیلاؤ میں ان افواج نے ضرور مدد کی ہوگی۔

"اردو اور شینا کے مشترک الفاظ" پر بحث کرتے ہوئے اکبر حسین اکبر نے بھی اسی نوعیت کا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"۱۸۴۲ء میں کشمیر کی فوج گلگت آئی، یہ فوجی اردو کو گلگت لائے اور اہلِ گلگت نے انہی سے پہلی مرتبہ اردو کا اکتساب کیا۔"[۱۰۸]

اکبر حسین اکبر کی یہ معلومات کہ گلگت میں اردو کو کشمیر کی فوج نے متعارف کرایا، اپنی جگہ درست ہے، لیکن کسی وجہ سے گلگت میں کشمیری فوج کی آمد کے بارے میں انھیں مغالطہ ہوا ہے۔ کشمیر کی فوج گلگت میں ۱۸۴۲ء کی بجائے ۱۸۴۵ء میں آئی اور ۱۸۴۶ء میں یہاں قبضہ مکمل ہوا، البتہ ۱۸۴۰ء میں کشمیر سے فوج گلگت نہیں بلکہ بلتستان آئی تھی۔ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کشمیر پر مہاراجا گلاب سنگھ کی حکومت رہی۔ ۱۸۵۷ء میں سیاسی صورتِ حال میں تبدیلی آئی۔ جب گلاب سنگھ کی وفات کے بعد اس کے جانشین مہاراجا رنبیر سنگھ ڈوگرہ حکومت کے حکمران بنے۔ انہوں نے اردو کے نفاذ پر کسی حد تک ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس کی مخالفت میں ڈوگری زبان کو رائج کرنے کے سلسلے میں کچھ اقدام بھی کیے۔

تاہم اردو بدستور دفتری زبان کے طور پر رائج رہی۔ اس کی وجہ اس کی مقامی زبانوں سے گھلنے ملنے کی صلاحیت اور اردو رسم الخط کی سہولت کے باعث اس کا مضبوط مقام تھا۔ بعد ازاں اسے انگریزوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ لہٰذا یہ زبان بدستور شمالی علاقوں میں پھلتی پھولتی رہی۔

ڈوگرہ دور میں ہی گلگت ایجنسی انگریزوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اس وقت ڈوگرہ حکومت کی عنانِ اقتدار مہاراجا رنبیر سنگھ کے ہاتھوں میں تھی۔ اس ضمن میں اکبر حسین اکبر کا درج ذیل بیان بھی وضاحت طلب ہے کہ:

> ''سکھوں کے بعد انگریزوں کے دور میں بھی اردو یہاں رابطے کے طور پر مستعمل رہی۔''[۱۰۹]

ان کا یہ بیان بھی اردو کے آغاز وارتقا کے ضمن میں ابہام پیدا کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ سکھوں کے بعد ڈوگرہ دور حکومت رہا۔ انگریزوں کا دور ڈوگروں کے عہد حکومت میں ہی شروع ہوا۔ انگریزوں نے اوّلاً اس علاقے میں ایجنسی ۱۸۷۷ء میں قائم کی اور انگریزوں کے اس پہلے دورِ حکومت (۱۸۷۷ء۔۱۸۸۱ء) سے قبل ہی اردو ان علاقوں میں سرکاری زبان کے طور پر نافذ ہو چکی تھی۔ انگریزوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے ۱۸۸۹ء میں دوسری بار ایجنسی کے قیام کے موقعے پر اردو ہی کو اپنی ترجمان زبان کے طور پر اختیار کیا۔ انگریز مقامی زبانوں سے ناواقف تھے اور مقامی افراد انگریزی زبان سے۔ جس کے باعث افہام وتفہیم اردو زبان کے ذریعے ہی ہو پاتی۔ جس کے لیے انگریزوں نے مترجم رکھنے کا رواج شروع کیا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اردو محض رابطے کے طور پر انگریزوں کے دور (۱۸۷۷ء ۔ ۱۹۴۷ء) میں مستعمل رہی۔ بلکہ اردو ۱۸۴۰ء کے بعد سرکاری زبان کے طور پر پہلے سے نافذ تھی۔ البتہ انگریزوں نے اردو کی ترویج وترقی کے لیے یہ تاریخی کام کیا کہ اسے ۱۸۹۲ء میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر بھی نافذ کر دیا۔

گلگت کے بعد اردو نے ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ بروشال نگر تک کا فاصلہ طے کیا۔ جس کی بابت شیر باز علی برچہ اپنے مقالے برائے ''ایم فل برائے پاکستانی زبانیں وادب'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اردو اور پنجابی الفاظ اس وقت سرایت کر گئے جب ان علاقہ جات میں ڈوگرہ افواج نے ڈیرے ڈالے اور ۱۸۹۳ء میں سکول کا آغاز ہوگیا۔''[۱۰]

اس طرح اردو نے تمام شمالی علاقوں میں بتدریج نافذ ہو کر اپنا سفر ۱۸۹۳ء میں مکمل کرلیا۔ الغرض شمالی علاقہ جات میں مذہب، زبان و ادب، تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مختلف اقوام کی سرزمین پر رنجیت سنگھ کی افواج کے حملہ آور ہونے سے دخل اندازی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان افواج میں موجودہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ پنجابی، ڈوگری، کشمیری، پشتو، ہندکو بولنے والے افراد مخلوط تھے۔ بلتستان پر قابض حملہ آوروں اور مقامی آبادی کے مابین گفتگو اور بات چیت کے لیے کسی ایسی زبان کی ضرورت تھی جو دونوں طرف مقصد کی افہام و تفہیم کے تقاضے پورے کر سکے۔ لشکر کی زبان میں اردو ہی اس مقصد کو پورا کر سکتی تھی۔ لہٰذا ابتدا میں اہلِ بلتستان کے ذہن میں ایک مخلوط زبان نے جگہ بنائی، جو کم عرصہ ہی میں درست زبان میں ڈھل گئی اور بالآخر ''اردو'' نام پایا۔ یہی صورتِ حال بہتر ہونے پر ۱۸۴۰ء میں اسکردو، ۱۸۴۶ء میں گلگت اور ۱۸۹۰ء میں بروشال نگر و ہنزہ پر مہاراجا گلاب سنگھ کے قبضے کے وقت اردو ہی کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا گیا۔ یوں شمالی علاقہ جات میں بتدریج اردو کا عملی نفاذ مکمل ہوا۔ کشمیر کے علاقے میں شمالی علاقہ جات کا خطۂ بلتستان، وہ خطہ ہے جس میں اردو سرکاری زبان کے طور پر اوّلاً رائج ہوئی۔ موجودہ کشمیر میں اردو سرکاری زبان کے طور پر ۱۸۸۵ء کے بعد نافذ ہوئی۔ کشمیر میں اردو کے سرکاری زبان ہونے کی بابت حبیب کیفوی بیان کرتے ہیں۔

''ڈوگرہ راج کا تیسرا حکمران مہاراجا پرتاب سنگھ ۱۸۸۵ء میں گدی نشین ہوا تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی کی بہ جائے اردو ہوگئی۔''[۱۱]

شمالی علاقہ جات میں اردو کے نفاذ کا مکمل جائزہ پیش کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غور کیا جائے کہ یہاں آنے والے حکمرانوں کی زبانوں اور مقامی زبانوں کی کیا صورتِ حال تھی، جب اردو نے پہلے پہل اپنا مقام اس علاقے میں بنایا۔

شمالی علاقہ جات میں حکمرانوں کا زبانوں کے ساتھ رویہ

شمالی علاقہ جات کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو مغل بادشاہ اکبر کے دور سے لے کر مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے تک یہاں سرکاری زبان کے طور پر فارسی رائج نظر آتی ہے۔ لیکن مغلوں اور پھر سکھوں کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ بعد ازاں ڈوگرہ راجاؤں کے آجانے سے رہے سہے آثار بھی ختم ہونے لگے، کیوں کہ یہ لوگ فارسی سے قطعاً ناواقف تھے۔ فارسی زبان ختم ہونے کے اور بھی کئی اسباب تھے۔ لیکن حبیب کیفوی کے خیال میں سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ڈوگرہ حکمران علم و ادب سے بے بہرہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''سکھوں کی حکومت پلٹی تو ۱۸۴۶ء میں ڈوگرے برسرِ اقتدار آگئے۔ یہ لوگ علم و ادب سے بالکل کورے تھے۔ اس لیے ان کے دور میں فارسی کے علم و ادب کی ترقی کا سوال ہی باقی نہ رہا۔'' ۱۱۲

اس کے برعکس ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں:۔

> ''مہاراجا گلاب سنگھ اور مہاراجا رنبیر سنگھ علم و دانش اور شعر و ادب سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ فارسی زبان کے ماہر تھے اور گلستان، بوستان اور دیوانِ حافظ کو نصابِ تعلیم کا اہم جزو سمجھتے تھے۔'' ۱۱۳

اگر صابر آفاقی کے اس بیان کو حقیقت مان لیا جائے تو ان دونوں مہاراجاؤں کے دور میں تصنیف و تالیف کی ترقی نظر آنی چاہیے، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ راجا گلاب سنگھ کا زمانہ حکومت (۱۸۴۰ء ۔ ۱۸۵۷ء) ہمیں معرکوں اور فتوحات سے بھرپور تو نظر آتا ہے، لیکن علم و ادب سے دل چسپی نظر آتی نہیں آتی۔ البتہ مہاراجا رنبیر سنگھ تصنیف و تالیف میں دل چسپی لیتے تھے۔ انھوں نے دارالترجمہ بھی قائم کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں محمد حسین آزاد کی تحریر کردہ ''دربارِ اکبری'' کا تذکرہ سن کر انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد سے ڈوگرہ حکومت کی تاریخ لکھوانے کی خواہش بھی کی تھی، جس کو علم و ادب سے دل چسپی خیال کیا جاتا ہے۔

''مکاتیبِ آزاد'' میں شامل میجر سیّد حسن بلگرامی کے نام خط بہ تاریخ ۱۸ اپریل ۱۸۸۳ء میں محمد حسین آزاد، مہاراجا کی فرمائش کے جواب میں لکھتے ہیں:

''ایک مہینے سے زیادہ ہوا کہ جموں سے ایک دوست کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ مہاراجا صاحب ایک تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں۔ جس میں عام سلاطین کے حالات ہوں، مگر زور اس بات پر ہو کہ سلطنت اس خاندان میں کیوں کر اور کن کن اسباب سے آئی اور گئی تو کن کن سببوں سے گئی۔ مثلاً بادشاہ کی بے پرواہی یا عیاشی یا بدنیتی وغیرہ سے یا ارکانِ دولت کی بے لیاقتی یا نمک حرامی سے۔ میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیا۔ آٹھ دس دن ہوئے کہ وہ خود آئے اور کہا کہ ان کی نوکری اختیار کرو تو کیا تنخواہ لو گے اور اس میں اصرار کیا۔ میں نے صاف جواب دے دیا اور انکار کیا۔'' [۱۱۴]

مہاراجا کی اس فرمائش سے ان کا منشا ادب میں اضافہ کرنا ہرگز نہ تھا، بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ڈوگرہ حکمرانوں کی شہرت بھی مغلیہ حکمرانوں کی طرح ہو جائے۔ مہاراجا رنبیر سنگھ خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن شعراء و ادبا کی سرپرستی کرتے تھے۔ البتہ ان کی خواہش یہ تھی کہ فارسی شعروادب کی بہ جائے ڈوگری زبان کو حکومت اور ریاست کے عوام میں یکساں مقبولیت حاصل ہو۔ کیوں کہ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ ڈوگری زبان مقامی طور پر جموں میں موجود بھی تھی اور یہ حکمران طبقے کی زبان تھی۔ لیکن اس کو رائج کرنے میں ناکامی کا سامنا ہوا۔

جس کا بڑا سبب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زبان جموں کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی ایک سے زائد شکلیں موجود تھیں۔ حبیب کیفوی کے خیال میں ڈوگری کا ایک عیب اس کا رسم الخط بھی تھا، جس کے باعث یہ تحریری زبان نہ بن سکی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''ڈوگری رسم الخط مہاجنی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے اور مشکل بھی ہے۔ مشکل ان معنوں میں کہ ایک کا لکھا ہوا دوسرے کے لیے وہی کچھ پڑھنا جو لکھا گیا ہے، مشکل ہے۔ اگرچہ اسے آسان بنانے کے لیے ڈوگری کے حامیوں نے بہت کچھ اصطلاحیں وضع کیں، لیکن یہ تعلیمی اور سرکاری زبان پھر بھی نہ بن سکی اور بہت کم وضع تحریر میں آئی۔'' [۱۱۵]

مذکورہ محرکات ہی ایسے قرار پائے کہ جن کے باعث ڈوگری زبان تحریر کے علاوہ بول چال میں بھی رائج نہ ہو سکی۔ اس کی ایک اور وجہ عوام کی ڈوگری زبان میں عدم دل چسپی تھی۔ اس ضمن میں حبیب کیفوی مزید لکھتے ہیں:

''فارسی کی مخالفت میں ڈوگرہ اُمراء نے ڈوگری کو آگے بڑھانے کی بڑی سازشیں کیں۔''[۱۱۶]

عوام کی اس عدم دل چسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وادیِ کشمیر مہاراجا گلاب سنگھ کو فروخت تو کر دی گئی تھی مگر مہاراجا جبری فتوحات کی وجہ سے عوام کا دل جیتنے میں ناکام رہا، جس کی وجہ سے عوام نے نہ تو مہاراجا کو اور نہ ہی اس کی زبان کو اہمیت دی۔ ظاہراً وہ کھل کر زبان کی مخالفت نہ کر سکے مگر اس کی ایک صورت یہ سامنے آئی کہ ڈوگری، حکومت کی زبان ہوتے ہوئے بھی رائج نہ ہو سکی۔ البتہ پاٹ شالوں میں سنسکرت کے علاوہ ڈوگری تعلیم نافذ تھی۔ ظاہر ہے اس کا اثر ایک محدود حلقے میں تھا۔ اس پر عوامی توجہ نہیں تھی۔ حبیب کیفوی اس صورتِ حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پاٹ شالوں میں سنسکرت اور ڈوگری میں تعلیم دی جاتی تھی اور مہاراجا رنبیر سنگھ کا ذاتی رجحان ڈوگری کی ترویج کی طرف تھا۔''[۱۱۷]

اسی لیے خود مہاراجا نے درخواستیں اور حسابات کے گوشوارے لکھوانے میں فارسی کے ساتھ ڈوگری سے بھی کام لیا، مگر شمالی علاقہ جات کے عوام نے اس زبان کو نہ قبول کرنا تھا، نہ کیا۔ کیوں کہ کسی بھی خطے یا علاقے کی زبان کا باہمی تبادلہ وہاں کے لوگوں کے مابین پائے جانے والے قدرتی ملاپ کا نتیجہ ہوتا ہے اور ان کا میل جول اور لین دین ہی زبانوں کے لسانیاتی اشتراک کا باعث بنتا ہے۔ یوں اردو ہی وہ واحد زبان تھی جو اس لسانی اشتراک کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ لہٰذا اردو ہی اتفاقِ رائے سے سرکاری زبان کا درجہ پا سکی۔ حکمرانوں کی زبانوں کی صورتِ حال کے بعد اب ہم مقامی طور پر بولی جانے والی زبانوں کی طرف آتے ہیں۔

مہاراجا رنجیت سندھ کے زمانے (۱۸۱۹ء ۔ ۱۸۳۹ء) میں شمالی علاقہ جات میں موجود مقامی زبانوں میں شینا، بلتی، بروشسکی، واخی، کھوار، پشتو، کوہستانی، کشمیری، الیغور، ہندکو، فارسی، پنجابی، گوجری اور ڈومکی زبانیں شامل تھیں۔ لیکن ان تمام زبانوں میں محدودیت نمایاں تھی۔ ہر زبان کا الگ رسم الخط، لب و لہجہ اور قواعد نامانوس معلوم ہوتے تھے، جب کہ ایک وادی کے لوگ دوسری وادی کی زبان سے ناواقف تھے۔

یہ تقریباً ایسی ہی صورتِ حال تھی، جیسی کہ بہ قول سیّد سلیمان ندوی ہندوستان میں زبانوں کے اختلاف کی صورت میں سامنے آئی، وہ لکھتے ہیں کہ:

"خیال کیا جاسکتا ہے کہ ایسا ملک جس میں کم از کم تیرہ مختلف زبانیں بولی جاتی ہوں، اُس کو ایک مملکت، ایک حکومت اور ایک ملک کیوں کر قرار دیا جاسکتا تھا اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لیے ایک متحدہ و مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی۔ یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا اور اس کو ترقی دی۔"[۱۱۸]

درج بالا صورتِ حال کے تحت جب شمالی علاقہ جات میں ایک ایسی حکومت کی تشکیل ہوئی، جس کے حکمران کئی زبانوں کو ساتھ لے کر آئے تو نئی حکومت اور مقامی لوگوں کو ایک ایسی زبان کی ضرورت پڑی جو حکمرانوں اور عوام کے درمیان رابطے کا کام دے۔ ایسی ہی ایک زبان نئے حکمران بھی ساتھ لائے تھے جو اس کی فوج میں رابطے کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ چناں چہ مقامی لوگ ان نئے حکمرانوں اور اس نئی زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لہٰذا اس زبان کو غیر محسوس طور پر اپناتے چلے گئے۔

رنجیت سنگھ کے بعد مہاراجا گلاب سنگھ کی فتوحات جاری رہیں۔ اس نے جب ۱۸۴۰ء میں بلتستان پر قبضہ کیا تو عوام اور حکمرانوں کے درمیان اردو ایک مضبوط رابطے کی زبان کے طور پر موجود تھی۔ اس صورتِ حال کی بابت شمیم بلتستانی لکھتے ہیں کہ:

"مقامی زبانوں سے دوستانہ ماحول میں روابط بڑھانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھنے والی زبان اردو کی مقبولیت بلتستان میں بڑھتی چلی گئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اردو زبان کی دل کشی، اہمیت اور افادیت کے قائل ہوتے چلے گئے۔"[۱۱۹]

ابتدائی طور پر اردو کے عوامی سطح پر بولے جانے کا تحریری ثبوت مہاراجا گلاب سنگھ کے دربار جموں ہی میں ملتا ہے۔ جب سائل فریاد کرتا تھا کہ "مہاراجا عرض ہے" جسے سن کر مہاراجا سائل کی فریاد سنتا اور فوری طور پر احکامات صادر کرتا۔ حبیب کیفوی اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"مہاراجا یہ سن کر سائل تک پہنچایا اسے اپنے پاس بلا کر اس کی عرض سنتا اور موقع پر ہی ضروری احکام صادر کر دیتا۔ یہ خاص اُردو کا جملہ ہے جو آج بھی اسی طرح بولا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو آج سے ایک صدی پیش تر بھی جموں میں سمجھی جاتی تھی، بلکہ گلاب سنگھ کے زمانے کے پٹے بھی موجود ہیں جو اُردو میں لکھے گئے ہیں۔"[۱۲۰]

درج بالا بیان سے ہم درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

۱۔ مہاراجا گلاب سنگھ کے دربار میں کشمیر پر قبضے کے بعد اُردو باقاعدہ طور پر بولی جا رہی تھی۔

۲۔ اردو میں بولا جانے والا جملہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فریادی چوں کہ ہر طبقے سے آتے تھے، اس لیے عوام میں بھی اردو بولنے کا قوی رجحان موجود تھا۔

۳۔ مہاراجا گلاب سنگھ کے زمانے (۱۸۲۲ء ۔ ۱۸۵۷ء) میں اردو اس درجے پر پہنچ چکی تھی کہ اس میں پٹے لکھے جاتے تھے۔ پٹے اگرچہ ڈوگری شاعری کی صنف ہے لیکن اس زمانے میں اسے اردو زبان میں بھی اختیار کیا گیا۔

اس صورتِ حال کو سر فریڈرک ڈریو کی درج ذیل رائے مزید واضح کرتی ہے:

> ''قصبہ جموں میں عوام ڈوگری، پنجابی اور ہندوستانی یعنی اردو کو ملا جلا کر بولتے ہیں۔ مہاراجا کے دربار میں شاید ہی کوئی اہل کار ڈوگری بولتا ہے۔ البتہ گفتگو میں کوئی نہ کوئی لفظ ڈوگری کا بول جاتا ہے۔ ہندوستان سے بسلسلۂ ملازمت آنے والے لوگ بلاشبہ ہندوستانی زبان بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے بہ خوبی سمجھتے ہیں۔''[۱۲۱]

جموں کی صورتِ حال بلتستان میں نافذ ہوئی۔ بلتستان اور گلگت میں اردو رائج ہونے کے بعد ۱۸۷۷ء میں انگریزوں کے ذریعے گلگت میں ایجنسی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی اثنا میں اردو کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں جب انگریزوں نے دوبارہ گلگت ایجنسی قائم کی تو اردو کا ایک مقام و مرتبہ متعین ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں یرشال نگر، ہنزہ کے مقامات تک اردو کا نفاذ مکمل ہوگیا۔ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق نہ صرف مقامی لوگ بلکہ سیاح بھی اردو زبان سے بہ خوبی استفادہ کر سکتے تھے۔ اس رپورٹ کے مطابق:

> ''کشمیر میں جو سیاح آتے ہیں، ان کے مقاصد ہندوستانی یا پنجابی زبان سے باآسانی پوری ہو سکتے ہیں۔''[۱۲۲]

۱۸۹۲ء میں صورتِ حال تبدیل ہوگئی اور ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۴ء میں بالترتیب اسکردو اور گلگت کے مقامات پر اسکولوں کا قیام عمل میں لایا گیا تو ذریعۂ تعلیم اردو ہی اختیار کیا گیا، جب کہ ۱۸۹۴ء کی دستیاب ریونیو رپورٹ کا جائزہ لینے سے علم ہوتا ہے کہ اس وقت

تک اردو زبان اس قابل ہو چکی تھی کہ تمام سرکاری عہدوں اور دفاتر کے اہل کاروں کے نام اردو میں لکھے جاتے تھے۔ ۱۲۳ شمیم بلتستانی کا درج ذیل بیان اس صورت کو مزید واضح کرتا ہے۔

> "۱۸۴۰ء میں سقوط بلتستان کے بعد ڈوگروں نے فارسی کی جگہ اردو کو رواج دینا شروع کر دیا اور ایک سو سال تک نہ صرف بلتستان بلکہ پورے شمالی علاقہ جات میں اردو کی عمل داری رہی۔ سرکاری دفتروں میں صد فی صد کام صرف اردو میں ہوتا تھا۔ تمام سرکاری عہدوں کے نام بھی اردو ہی میں ہوا کرتے تھے۔ جیسے محرر مال، افسر مال، واصل باقی نویسی، سیاہ نویسی، صدقانون گو، دفتر قانون گو، محافظ دفتر، ناظر، داروغہ باغات، دیوان وغیرہ۔" ۱۲۴

الغرض اردو زبان نے اپنی بعض فطری صلاحیتوں کے باعث شمالی علاقہ جات میں تقریباً ۷۰ برس کے عرصے میں مکمل طور پر قدم جما لیے۔ اس نے نہ صرف یہاں کی مقامی بولیوں کو متاثر کیا بلکہ ادب پر بھی اپنے اثرات ثبت کرنا شروع کر دیے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں اس کے خلاف نفرت کا ایک جذبہ بھی بیدار ہونا شروع ہو گیا۔ اس ذیل میں ہم اردو کی راہ میں حائل مشکلات کا ایک جائزہ پیش کریں گے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نے کیوں کر ان علاقوں میں اپنا مقام برقرار رکھا؟

اُردو کے نفاذ میں حائل مشکلات کا جائزہ

بہ ظاہر اردو نے سرکاری زبان تک سفر ۱۸۴۰ء میں طے کر لیا، لیکن اس کی راہ میں بعد ازاں بھی مشکلات حائل ہوتی رہیں۔ اس ضمن میں اوّل اوّل مہاراجا رنبیر سنگھ نے اپنا کردار ادا کیا، جب گلاب سنگھ کے بعد وہ تخت و تاج کے مالک بنے (۱۸۵۵ء۔۱۸۸۵ء) وہ کشمیر میں ڈوگری کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنا چاہتے تھے۔ البتہ ان کوششوں میں وہ کام یابی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ حبیب کیفوی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

> "۔۔۔اس لیے کہ اس میں وہ اہمیت ہی نہ تھی جو دفتری زبان کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تعلیمی اور ادبی زبان نہ بن سکی اور نہ اس میں ڈوگری کا سرمایۂ ادب محفوظ ہو سکا۔" ۱۲۵

اس مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ مہاراجا گلاب سنگھ اور مہاراجا رنبیر سنگھ کی تعلیمی ترقی کی جانب کوئی توجہ نہیں تھی۔ اردو چوں کہ ترقی کی راہ پر گام زن تھی۔ لہٰذا اوّلین کوشش کے طور پر انھوں نے ڈوگری کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تاکہ تخت و تاج کے لیے سود مند ثابت ہو لیکن اردو اپنے قدرتی مزاج کے باعث اپنی جگہ بنا کر رہی اور مہاراجا کی کوشش ناکام ہوگئی اور بالآخر انھوں نے خود اُردو کے نفاذ میں معاونت کی۔

اس ضمن میں دوسرا کردار خود اہلِ بلتستان نے ادا کیا۔ اس کی وجہ دینِ اسلام سے ان کی قربت تھی۔ شمیم بلتستانی اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں۔

> ''۱۸۴۰ء میں سقوطِ بلتستان کے بعد جب ڈوگروں کا تسلط ہوا تو ڈوگرہ نے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا۔ فارسی زبان سے پوری طرح مستفید اس زبان کو بلتستان والے باآسانی اپنا سکتے تھے۔ لیکن ذہنی طور پر بلتستان والوں نے اردو کو عربی اور فارسی کا حریف اور رقیب سمجھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اردو چوں کہ غاصب ڈوگروں کی مسلط کردہ زبان ہے، اس لیے ہمیں حسبِ سابق عربی اور فارسی ہی کو اپنانا چاہیے۔ کیوں کہ یہ ہماری دینی زبان ہے۔''[۱۲۶]

بعد ازاں یہی صورتِ حال کشمیر میں بھی رہی، جب راجا رنبیر سنگھ کے ایما پر مکتب اور پاٹ شالے کھولے گئے اور وہاں فارسی اور اردو نصاب شامل کیا گیا۔ جس کی عوام میں مخالفت ہوئی۔ اس صُورتِ حال کو حبیب کیفوی نے وضاحت کے ساتھ ''ادبی دنیا'' میں تحریر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''جلد ہی شہر میں مکتب اور پاٹ شالے کھولے گئے۔ جہاں پنجاب کے مکتبوں کے طرز پر فارسی اور اردو کا نصاب جاری ہوا۔ جہاں سرکاری حکم سے بچوں کو تعلیم دلوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتداء میں عوام ڈرے کہ کہیں فارسی کی تدریس ان کے بچوں کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہ کر دے۔''[۱۲۷]

اردو کی مخالفت کے باوجود یہی لوگ اردو کے دوستانہ ماحول میں روابط بڑھانے کی صلاحیت کے باعث اس کی مقبولیت کے قائل ہوگئے اور جلد ہی انھوں نے اردو کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔

الغرض شمالی علاقہ جات میں انگریزی کے علاوہ چودہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں پانچ زبانیں بلتی، فارسی، شینا، بروشسکی اور کھوار ایسی ہیں، جن کا اپنا رسم الخط اور ادبی سرمایہ ہے اور ان کے ادب نے شمالی علاقہ جات میں ترقی بھی کی۔ کاشغری اور وخی دو ایسی زبانیں ہیں جن کا اپنا رسم الخط بھی ہے اور ادبی سرمایہ بھی، لیکن ان کے ادب نے وہ ترقی نہیں کی، جو مذکورہ بالا زبانوں نے کی ہے۔

ان کے علاوہ پانچ زبانیں ایسی ہیں جن کا ادبی سرمایہ اردو یا عربی رسم الخط میں ہے۔ ان میں پنجابی، پشتو، ہندکو، گوجری اور کشمیری شامل ہیں اور شمالی علاقہ جات میں دو زبانیں ایسی ہیں جنھوں نے لسانی روابط سے جنم لیا۔ ان کا کوئی مخصوص رسم الخط نہیں اور نہ ہی ادبی سرمایہ ہے، یہ محض بولیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں ڈوگری اور کوہستانی کہا جاتا ہے۔

مذکورہ صورتِ حال میں اس سوال کے جواب کی تلاش، کہ چودہ زبانوں کی موجودگی میں اردو زبان نے یہاں کس طرح قدم جمائے اور کس طرح یہاں کی بولیوں کو متاثر کیا اور کن وجوہات کی بنا پر اردو نے یہاں نمائندہ زبان کی حیثیت اختیار کر لی، دل چسپی سے خالی نہیں۔ یہی سوالات ابتدا میں بھی اٹھائے گئے تھے اور یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ مقامی زبانوں میں رابطے کی وہ قوت نہیں پائی جاتی، جو اردو زبان میں ہے اور مقامی زبانوں کے ادب میں بھی وہ تنوع اور خیالات نہیں پائے جاتے، جو مقامی زبان بولنے والوں کا تذکیہ کر سکیں۔

ایک تفصیلی تحقیقی و تنقیدی جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارا خیال درست تھا۔ اس کی وجوہات ذیل میں نکات کی صورت میں خلاصۂ تحقیق کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ ہماری رائے میں شمالی علاقہ جات میں اردو زبان کی آمد کا سب سے بڑا محرک ۱۸۱۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے قبضے کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہاراجا کی افواج میں فارسی، پنجابی، ڈوگری، پشتو، ہندکو اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اردو بولنے والے بالخصوص رام پوری پٹھان وغیرہ شامل تھے۔ مختلف زبانیں بولنے والوں کی جو کیفیت فوج میں ملتی ہے یہی صورتِ حال دربار میں بھی

تھی۔ علاوہ ازیں رنجیت سنگھ کے دور میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ لیکن اس کے بیش تر منشی اردو اور پنجابی زبان بولا کرتے تھے۔ گویا رنجیت سنگھ کی فوج، دربار اور دفاتر میں رابطے کی زبان اردو تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دور میں اردو علم و ادب پنجاب کے طول و عرض پر پھیل چکا تھا۔ اس وجہ سے شعوری طور پر مہاراجا رنجیت سنگھ اردو کو فارسی پر ترجیح دیتا تھا۔

۲۔ رنجیت سنگھ کے بعد گلاب سنگھ نے اردو کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اسے سرکاری زبان قرار دے دیا۔

۳۔ رنبیر سنگھ نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور گذشتہ حکومت کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

۴۔ ڈوگروں کے بعد انگریزوں نے بھی اردو زبان کی سرپرستی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں پہلے ہی اردو کو سرکاری یا دفتری زبان قرار دے چکے تھے۔ انگریزی کے اہلِ کاروں کی تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ اردو زبان سیکھے بغیر وہ ہندوستان کا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ مزید برآں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اثر انگریز حکمرانوں کے لیے تالیف کی گئی گرائمر میں ہندوستانی کا سیکھنا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اس تالیف کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام حضرات جو ہندوستان کے لیے آمادۂ سفر ہوں، ان کے لیے یہاں کی سب سے مفید اور علاقے میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کا حصول آسان ہو سکے۔ پچھلے چند برسوں سے ہندوستانی زبان کے مطالعے کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ اب کمپنی کی ملازمت میں ہر جونیئر افسر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس زبان کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے، جس کے بغیر نہ اسے سپاہ کی کمان سپرد کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی اعلیٰ افسری کا عہدہ دیا جا سکتا ہے۔" [۱۲۸]

۵۔ مقامی زبانوں اور ڈوگری کے مشکل قواعد نے اردو کے پھیلاؤ میں مثبت کردار ادا کیا۔ ان زبانوں کے اصول و قواعد سیکھنا بہ نسبت اردو کے مشکل تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک زبان سیکھ کر بھی دوسری زبان سے رابطہ نہ ہو پاتا تھا۔ لہٰذا اس صورتِ حال میں اردو ہی ایک آسان اور مشترک راستہ ثابت ہوئی۔

مقامی زبانوں میں سے ہر ایک کا رسم الخط اور قواعد نامانوس تھے اور محض ایک قبیلے تک محدود تھے۔ یہ قبیلے بھی سیکڑوں مربع میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال میں دوسری اقوام سے ان کی زبانوں میں رابطہ کرنا مشکل تر تھا۔ اردو نے ان مشکلات کے دریا کو پاٹ دیا اور لوگوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے اِسے شعوری اور غیر شعوری طور پر قبول کر لیا۔

۷۔ انگریز اور ڈوگرہ حکمران بہ نسبت مقامی زبانوں کے اردو کو رابطے کے لیے آسان سمجھتے تھے، یہ زبان تمام مقامی بولیوں کا احاطہ کر سکتی تھی۔ دونوں حکمران متفقہ طور پر اسی زبان کو سمجھ سکتے تھے۔ لہٰذا وہ اس کے نفاذ کے لیے مجبور ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اردو کے لیے مزید آسانیاں پیدا کر دیں۔

۸۔ انگریز اپنی حکمرانی اس تمام علاقے پر برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اردو زبان کی سرپرستی کی، جس کے باعث اسے یہاں فروغ حاصل ہوا۔

۹۔ مذہبی پسِ منظر نے اردو کے نفاذ کے لیے ایک محرک کا کام دیا۔ قبولِ اسلام کے بعد سنسکرت کا اثر یک سر ختم ہو گیا اور عربی، فارسی تعلیمات کے ساتھ ساتھ نیا رسم الخط بھی معاشرے میں رائج ہوا۔ مقامی زبانوں کی نسبت عربی و فارسی رسم الخط اردو کے زیادہ قریب تھا، جس نے بعد ازاں اردو کے لیے راہیں آسان بنا دیں۔

۱۰۔ مقامی لوگ مدتوں سے ایک محدود علاقے میں رہائش پذیر تھے، ان کی سوچ محدود تھی اور وسائل بھی۔ فوجی جو باہر سے آئے، مقامی افراد کی نسبت گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہوتے تھے، مقامی افراد ان لوگوں کے سامنے موازنے کے بعد خود کو کم تر پاتے اور فوجی کی شخصیت بھلی معلوم ہوتی، جس سے متاثر ہو کر انھوں نے اس زبان کو اپنا لیا۔

۱۱۔ اردو کو نئی زبان کے طور پر سیکھنے کے بعد سپاہیوں اور انتظامی عملے سے قربت ممکن ہو سکتی تھی اور مقامی افراد اپنے رتبے کو بلند کرنے کی خاطر ان اجنبیوں سے قریب ہونا چاہتے تھے، جس کے لیے اردو ہی رابطے کا ایک ذریعہ تھی۔ لہٰذا مقامی افراد نے اسے بہ خوشی اپنا لیا۔

۱۲۔ شمالی علاقہ جات سے جو مسلمان تعلیم، کاروبار یا سیاحت کی غرض سے ہندوستان جاتے تھے، وہ اردو کی اہمیت کو پہچانتے تھے، چناں چہ انھوں نے اسے شعوری طور پر اپنا لیا۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات کے باعث یہ شعور پختہ ہوا کہ یہ مسلمانوں کی

زبان ہے اور اسے اختیار کرنا ایک ملّی ضرورت ہے۔ اس صورتِ حال نے اردو کے پھیلاؤ میں مثبت کردار ادا کیا۔

۱۳۔ ہندوستان سے مقامی لوگ جب تعلیم یافتہ ہو کر آئے تو مقامی معاشرے میں آئیڈیل قرار پائے۔ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر مقامی افراد میں بھی نئی زبان کو سیکھنے کا شعور پیدا ہوا۔

۱۴۔ شمالی علاقہ جات میں پندرہ زبانوں کی موجودگی میں بھی ایک ہمہ گیر زبان کی ضرورت موجود تھی۔ چناں چہ اردو نے یہاں پہنچ کر غیر محسوس طریقے سے میل جول کا کام انجام دیا۔ اس کی اس خوبی کے باعث اسے فوراً اپنا لیا گیا۔

۱۵۔ مقامی زبانوں کی سب سے اہم ضرورت ایک ایسا رسم الخط تھا جس کے ذریعے وہ شمالی علاقہ جات کے علاوہ پوری دنیا میں اپنی بات پھیلا سکیں۔ یہ ضرورت بھی اردو کے ذریعے پوری ہوئی۔ اس کے فوائد بہت جلد سامنے آنا شروع ہو گئے۔ جس کی وجہ سے مقامی زبانوں کے ادباء نے خصوصیت کے ساتھ اردو زبان کو اپنا لیا۔

۱۶۔ ادب کے علاوہ یہاں کی اقوام نے جب یہ ضرورت محسوس کی کہ اپنے تہذیب و تمدن کو بھی دنیا میں منوایا جائے تو اردو نے اس معاملے میں بھی اُن کا ساتھ دیا۔ آج برّصغیر پاک و ہند میں لوگ اردو ہی کی بہ دولت اس علاقے کے ادب اور اقوام کے متعلق واقفیت رکھتے ہیں۔

۱۷۔ اردو کی اس حیثیت کے مذکورہ مشاہدے نے شمالی علاقہ جات کے ادباء و شعراء و محققین کو اردو ادب کے قریب تر کر دیا، جس کے باعث یہاں کے تخلیق کاروں کو نت نئے موضوعات اور اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا منفرد سلیقہ میسر آیا۔ یوں بہ تدریج اردو کا پھیلاؤ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

حوالے:

۱ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ زبانوں پر طویل عرصے سے تا حال تحقیق جاری ہے۔ بعض زبانوں کی قدامت کے سلسلے میں محض صدیوں پہلے کا تذکرہ ملتا ہے۔ تاہم اب تک ہونے والی تحقیق کی روشنی میں ان زبانوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔

۲ حمید اللہ ہاشمی: ''پاکستانی زبانیں (پنجابی، پہاڑی گوجری)'' اسلام آباد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۔
۳ ایضاً ص ۲۱۔
۴ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''پنجابی زبان وادب'' از حمید اللہ شاہ ہاشمی، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء۔
۵ ڈاکٹر محمد شجاع ناموس: ''گلگت اور شینا زبان'' بہاولپور، اردو اکادمی ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۱۔
۶ سیّد عالم: ''شمالی علاقہ جات کا لسانی و ادبی جائزہ'' اسلام آباد، ناشر ندارد ۱۹۹۰ء، ص ۳۷۔
۷ اکبر حسین اکبر: ''شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب'' اسلام آباد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۲۰۰۴ء، ص ۶۳۔
۸ ڈاکٹر محمد شجاع ناموس: ''گلگت اور شینا زبان''، ص ۱۱۷۔
۹ اکبر حسین اکبر: ''شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب''، ص ۶۵۔
۱۰ امین ضیا: ''شینا قاعدہ اور گرامر''، گلگت، ناشر ندارد، ۱۹۸۶ء۔
۱۱ عبدالخالق تاج: ''شینا قاعدہ''، راول پنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۔
۱۲ گریرسن: ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا''، ص ۱۲۵۔
۱۳ وزیر اشرف خان: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' جلد ۱۴، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۲۔
۱۴ ایضاً، ص ۳۵۔
۱۵ فضل الرحمٰن عالمگیر: ''قراقرم ہندوکش'' اسلام آباد، برق سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۵ء، ص ۳۵۔۷۔
۱۶ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: سیّد عالم: ''شمالی علاقہ جات کا لسانی و ادبی جائزہ''۔
۱۷ ایضاً، ص ۵۵۔
۱۸ جمشید خان دُکھی: ''شینا ادب میں طنز و مزاح''، گلگت، حلقۂ اربابِ ذوق، ۱۹۹۹ء، ص ۲۵۴۔
۱۹ یوسف حسین آبادی: ''بلتستان پر ایک نظر'' اسکردو، شبیر آفسٹ پرنٹرز، ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۵۔
۲۰ ایضاً، ص ۱۴۳۔
۲۱ یوسف حسین آبادی: ''تاریخ بلتستان'' اسکردو، بلتستان بک ڈپو، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲۱۔
۲۲ نادرہ زیدی: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، ص ۱۵۔
۲۳ یوسف حسین آبادی: ''بلتستان پر ایک نظر''، ص ۱۵۲۔
۲۴ نادرہ زیدی: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد ۱۴، ص ۱۷۔
۲۵ راجہ محمد علی شاہ صبا: ''تقریب آزادی''، اسکردو، ادبی بورڈ شگر، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۔
۲۶ بلتی زبان کے تمام محققین اس تقسیم پر متفق ہیں۔ تاہم تفصیل کے لیے دیکھیے:
محمد حسن حسرت، ''تاریخ ادبیاتِ بلتستان''۔
۲۷ غلام حسن حسنی: ''تم لو'' اسکردو، شبیر پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۴ء۔
۲۸ اردو بلتی قاعدہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء۔

۲۹ شیر باز علی برچہ: ''مجلہ کارواں'' خپلو، کاروانِ ادب، سنہ اشاعت ندارد، ص ۱۷۱۔
۳۰ احمد حسن دانی: ''شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۱۷۔
۳۱ غلام رسول: ''آزادیِ گلگت بلتستان اور حقائق'' راول پنڈی، ون انٹرنیشنل پبلیشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۔
۳۲ رضا ہمدانی: ''اخبار اردو (شمارہ جولائی، اگست)''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۔
۳۳ عبداللہ جان عابد: ''ایم فل پاکستانی زبانیں وادب''، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۶۔
۳۴ ایضاً، ص ۷۔
۳۵ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''پاکستانی زبانیں وادب (پشتو، ہندکو، توروالی، گاؤری)''، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء۔
۳۶ شیر باز علی برچہ: ''پاکستانی زبانیں''، ص ۱۷۵۔
۳۷ نصیر الدین نصیر ہنزائی: ''شمول بوق''، کراچی، شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، ۲۰۰۳ء، ص ۴۵۔
۳۸ ایضاً، ص ۲۔
۳۹ پاکستانی زبانیں۔
۴۰ ایضاً۔
۴۱ گریرسن: ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا''۔
۴۲ ڈاکٹر شجاع ناموس: ''گلگت اور شینا زبان''، ص ۳۵۔
۴۳ اکبر حسین اکبر: ''شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب''، ص ۶۰۔
۴۴ محمد حسن حسرت: ''پیغام آشنا''، اسلام آباد، ثقافتی کونسلیٹ ایران، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۷۔
۴۵ یہ تصنیفات بلتستان کے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی شکل میں موجود ہیں۔
۴۶ یہ معلومات بلتستان وگلگت میں موجود بزرگوں کے ذریعے ملی ہیں۔
۴۷ میر غلام احمد کشفی: ''رسالہ ادبی دنیا''، کشمیر نمبر لاہور، صلاح الدین احمد، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۷۔
۴۸ میر عبدالعزیز: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک وہند'' (جلد ۱۴)، ص ۱۵۱۔
۴۹ میر غلام احمد کشفی: ''ادبی دنیا''، ص ۲۰۴۔
۵۰ ایضاً۔
۵۱ مرزا عارف بیگ: ''رسالہ آج کل'' (کشمیر نمبر)، دہلی، جوش ملیح آبادی، ۱۹۵۵ء، ص ۳۳۔
۵۲ سلیم خان گمی: ''کشمیر ادب وثقافت'' لاہور، یونیورسل بکس، سنہ ندارد، ص ۱۶۔
۵۳ میر غلام احمد کشفی: ''ادبی دنیا''، ص ۲۰۸۔
۵۴ عارف بیگ مرزا: ''رسالہ آج کل''، کشمیر نمبر، دہلی جوش ملیح آبادی، ۱۹۵۵ء، ص ۳۳۔
۵۵ ڈاکٹر صابر آفاقی: ''پاکستانی زبانیں''، ص ۳۲۳۔
۵۶ ایضاً، ص ۳۲۲۔

۵۷ مولوی عبدالحق: ''رسالہ اردو'' اورنگ آباد، ۱۹۲۷ء، ص ۵۴۱۔
۵۸ ڈاکٹر صابر آفاقی: ''پاکستانی زبانیں''، ص ۳۲۷۔
۵۹ ایضاً، ص ۳۲۷۔
۶۰ ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی: ''پاکستانی زبانیں''، ص ۱۰۵۔
۶۱ .O. Lorimer, "Language Hunting in the Karakoram", Karachi, Indus Publications, 1938, Page 19
۶۲ عنایت اللہ فیضی: ''سہ ماہی ادبیات'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات، سنہ ندارد، ص ۳۱۲۔
۶۳ عنایت اللہ فیضی: ''پاکستانی زبانیں وادب''، ص ۱۰۸۔
۶۴ پروفیسر اسرار الدین: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، ص ۹۱۔
۶۵ E.O. Lorimer, "Language Hunting in the Karakoram", Page 1
۶۶ عثمان علی: ''وخی زبان مع قاعدہ'' گلگت، ناشر ندارد، ۲۰۰۰ء، ص ۸۱۔
۶۷ احمد جامی نجی: ''وخی زبان (تاریخ کے آئینے میں) مع قاعدہ'' گلگت، ناشر ندارد۔
۶۸ محمد حسن حسرت: ''شمالی علاقہ جات کی زبانیں وادب'' اسلام آباد، ص ۲۵۹۔
۶۹ وزیر قدرت اللہ بیگ: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، (جلد ۱۴)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء، ص ۴۷۔
۷۰ ایضاً، ص ۴۷۔
۷۱ یہ شمالی علاقہ جات میں موجود ان زبانوں میں سے ایک ہے جنہیں آج تک شاملِ تحقیق نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ ان اقوام کو شمالی علاقہ جات میں رہائش پذیر ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔
۷۲ منظوم علی: ''قراقرم ہندوکش''۔
۷۳ یہ بیان کاشغر سے آئے ہوئے معمر افراد سے حاصل کی گئی معلومات پر مبنی ہے۔
۷۴ ان کا زمانہ تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔
۷۵ یوسف حسین آبادی: ''تاریخ بلتستان'' اسکردو، بلتستان بک ڈپو، ۲۰۰۳ء، ص ۳۵۷۔
۷۶ پروفیسر خاطر غزنوی: ''پاکستانی زبانیں''، ص ۱۸۱۔
۷۷ ہارون الرشید: ''بوندیں''، راول پنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، سنہ اشاعت ندارد۔
۷۸ انگریزی زبان کو شمالی علاقہ جات میں بولی جانے والی زبانوں کے اعتبار سے فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب کا قدامت سے تعلق نہیں، بلکہ علاقے میں قدیم زمانے سے بولی جانے والی بڑی زبان کے طور پر یہ مستقل شمالی علاقہ جات کا حصہ بن چکی ہے۔
۷۹ شیر باز علی برچہ: ''جلوہ شمال''، اسکردو، بلتستان ادبی بورڈ، ۱۹۹۹ء۔
۸۰ شیر باز علی برچہ: ''گلگت ۱۹۱۷ء سے پہلے'' گلگت، ہنی سارا پبلشنگ نیٹ ورک، ۲۰۰۲ء، ص ۳۷۔

۸۱ وزیر محمد اشرف: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، جلد ۱۴، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۴ء، ص ۳۱۔
۸۲ نادرہ زیدی: ایضاً ص ۱۵۔
۸۳ پروفیسر عثمان علی: ''خطۂ قراقرم زبانیں اور معاشرہ''، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۔
۸۴ یہ کتاب شمالی علاقہ جات کے بعض کتب خانوں میں قلمی شکل میں محفوظ ہے۔
۸۵ ''فقہ الاحوط''، سیّد محمد نور بخش کی فارسی تصنیف (جو قلمی شکل میں محفوظ ہے) سے مثالیں لی گئی ہیں۔
۸۶ یوسف حسین آبادی: ''بلتستان پر ایک نظر''، ص ۱۷۸۔
۸۷ یہ نام آج بھی زمانۂ قدیم کی طرز پر پکارے جاتے ہیں۔
۸۸ ''منظوم فقہ الاحوط'' از سیّد محمد نور بخش یہ بھی بلتستان کے ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔
۸۹ حمید اللہ ہاشمی: ''پنجابی زبان و ادب''، کراچی، انجمنِ ترقی اردو، ۱۹۸۸ء، ص ۶۔
۹۰ نریندر کرشن سنہا ''مہاراجا رنجیت سنگھ''، لاہور، ادارہ تخلیقات، ۱۹۹۲ء، ص ۷۰۔
۹۱ حمید اللہ ہاشمی: ''پنجابی زبان و ادب''، ص ۶۔
۹۲ ایضاً، ص ۱۴۷
۹۳ چرت سنگھ خود اپنے ہاتھوں گولی چلنے سے ہلاک ہو گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:
''پنجاب میں اردو'' از حافظ محمود شیرانی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء۔
۹۴ نامدار خان دتّ پنجاب کے معروف شاعر گزرے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:
''پنجاب میں اردو'' از حافظ محمود شیرانی۔
۹۵ حافظ محمود شیرانی ''پنجاب میں اردو''، ص ۲۸۰۔
۹۶ ڈاکٹر ممتاز گوہر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۱۔
۹۷ نریندر کرشن سنہا: ''مہاراجا رنجیت سنگھ''، ص ۱۵۸۔
۹۸ جی۔ ایم۔ میر: ''کوہستان قراقرم سے بحرِ قزوین تک''، لاہور، مکتبۂ داستان لمیٹڈ، ۱۹۹۴ء۔
۹۹ Fredric Drew, "Jammu and Kashmir Teritories"
۱۰۰ شیر باز علی برچہ ''مجلہ کارواں'' (شمارہ سوم)، خپلو، کاروانِ ادب، سنہ ندارد، ص ۱۷۱۔
۱۰۱ مہاراجا رنجیت سنگھ از نریندر کرشن سنہا، ص ۲۰۳۔
۱۰۲ یہ معلومات قراقرم رائٹرز فورم کے اراکین کے ہمراہ ایک میٹنگ میں مہیا کی گئیں۔
۱۰۳ شیر باز علی برچہ: ''مجلہ کارواں''، ص ۱۷۱۔
۱۰۴ ایضاً۔

۱۰۵ شمیم بلتستانی۔ ''اخبار اردو'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اپریل ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۔
۱۰۶ حبیب کیفوی: ''کشمیر میں اردو'' لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۴ء، ص ۴۵۔
۱۰۷ سیّد عالم: ''شمالی علاقہ جات میں اردو''۔
۱۰۸ اکبر حسین اکبر: ''اردو اور شینا کے مشترک الفاظ''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۹۔
۱۰۹ ایضاً۔
۱۱۰ شیر باز علی برچہ: ''نصاب برائے پاکستانی زبانیں و ادب'' اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۵۔
۱۱۱ حبیب کیفوی: ''کشمیر میں اردو''، ص ۴۹۔
۱۱۲ ایضاً، ص ۱۱۔
۱۱۳ ڈاکٹر صابر آفاقی: ''جلوۂ کشمیر''، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱۔
۱۱۴ محمد حسین آزاد: ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۰۔
۱۱۵ حبیب کیفوی: ''کشمیر میں اردو''، ص ۱۲۔
۱۱۶ حبیب کیفوی: ''ادبی دنیا''، (کشمیر نمبر)، لاہور، ناشر، صلاح الدین احمد ۱۹۶۶ء، ص ۲۸۲۔
۱۱۷ حبیب کیفوی: ''ادبی دنیا''، (کشمیر نمبر)، ص ۲۸۲۔
۱۱۸ سیّد سلیمان ندوی: ''نقوشِ سلیمانی'' لاہور، اردو مرکز ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۸۔
۱۱۹ شمیم بلتستانی: ''اخبار اردو''، ص ۲۳۔
۱۲۰ حبیب کیفوی: ''ادبی دنیا''، (کشمیر نمبر)، ص ندارد۔
۱۲۱ Fredric Drew, "Jammu and Kashmir Terretories"
۱۲۲ ''مردم شماری رپورٹ ۱۸۹۱ء، بابت کشمیر، لداخ، گلگت، مملوکہ حکومت شمالی علاقہ جات۔
۱۲۳ یہ ریونیو رپورٹ اگرچہ اب ضائع ہو چکی ہے، تاہم پروفیسر عثمان علی کے پاس محفوظ نقل کے ذریعے یہ معلومات حاصل ہوئیں۔
۱۲۴ شمیم بلتستانی: ''اخبار اردو''۔
۱۲۵ حبیب کیفوی: ''کشمیر میں اردو''، ص ۱۵۔
۱۲۶ شمیم بلتستانی: ''اخبار اردو''، ص ۲۳۔
۱۲۷ حبیب کیفوی: ''ادبی دنیا''، (کشمیر نمبر)۔
۱۲۸ ڈاکٹر الجالیت صدیقی مترجم ''ہندوستانی گرائمر'' از بینجمن شلوے، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۷۔

کتابیات

الف:

۱۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: مترجم ''ہندوستانی گرائمر'' از انجمن شلزے، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء۔

۲۔اکبر، حسین اکبر: اُردو اور شینا کے مشترک الفاظ''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء۔

۳۔امین ضیاء، ''شینا قاعدہ اور گرامر'' گلگت، ناشر ندارد، ۱۹۸۶ء۔

۴۔بادشاہ منیر بخاری: ''اُردو اور کھوار کے لسانی روابط'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء۔

۵۔برچہ، شیر باز علی خان: (مترجم) ''گلگت ۱۹۴۷ء سے پہلے'' گلگت، ہنی سارا پبلشنگ نیٹ ورک، ۲۰۰۲ء۔

۶۔تاج، عبدالخالق: ''شینا قاعدہ''، راولپنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۸۹ء۔

۷۔''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، جلد ۱۴، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

۸۔جی ایم میر: ''کوہستان قراقرم سے بحر قزوین تک''، لاہور، مکتبہ داستان لمیٹڈ، ۱۹۹۴ء۔

۹۔حبیب کیفوری ''کشمیر میں اُردو''، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۹ء۔

۱۰۔حسرت، محمد حسن: ''تاریخ ادبیات بلتستان''، راولپنڈی، ناشر کا نام ندارد، ۱۹۹۳ء۔

۱۱۔حسنی، غلام حسن: ''تم لو''، اسکردو، شبیر پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۴ء۔

۱۲۔دانی، احمد حسن: ''شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت''، اسلام آباد، خورشید پرنٹرز، ۱۹۸۷ء۔

۱۳۔رازدل، کوہستانی: ''بنیادی شینا اُردو لغت''، راولپنڈی، ناشر کا نام ندارد، ۱۹۳۳ء۔

۱۴۔زائر، محمد ابراہیم: ''مرتب جلوۂ شمال''، اسکردو، بلتستان ادبی بورڈ، ۱۹۹۹ء۔

۱۵۔سخی، احمد جامی: ''قومی زبان (تاریخ کے آئینے میں) مع قاعدہ''، گلگت، ناشر ندارد، سنہ ندارد۔

۱۶۔سنہا، نریندر کرشن، ''مہاراجا رنجیت سنگھ'' لاہور، ادارۂ تخلیقات، ۱۹۹۳ء۔

۱۷۔شجاع، ناموس، ڈاکٹر: ''گلگت اور شینا زبان''، بہاولپور، اُردو اکادمی ۱۹۴۱ء۔

۱۸۔''شمول برق''، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی، ۲۰۰۲ء۔

۱۹۔صابر آفاقی، ڈاکٹر: جلوۂ کشمیر'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء۔

۲۰۔صبا، محمد علی شاہ، راجہ: ''بلتی اُردو لغت''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳ء۔

۲۱۔صبا، محمد علی شاہ، راجہ: ''نقیب آزادی''، اسکردو، شگر ادبی بورڈ، ۱۹۹۸ء۔

۲۲۔عالم استوری، سید: ''شمالی علاقہ جات کا ادبی و لسانی جائزہ''، اسلام آباد، ناشر ندارد ۱۹۹۰ء

۲۳۔عالم استوری، سید: ''شمالی علاقہ جات میں اُردو''، رٹو، ناشر سید عالم، ۲۰۰۱ء۔

۲۴۔عثمان علی، پروفیسر: ''خطۂ قراقرم، زبانیں اور معاشرہ''، لاہور، ناشر ندارد، ۱۹۸۷ء۔

۲۵۔عثمان علی، پروفیسر: ''وخی زبان مع قاعدہ''، گلگت، ناشر ندارد، ۲۰۰۰ء۔

۲۶۔غلام رسول: ''آزادی گلگت و بلتستان''، راولپنڈی، دن انٹرنیشنل پبلشرز، ۲۰۰۴ء۔

۲۷۔ کوہلی، سیتا رام: ''مہاراجا رنجیت سنگھ''، لاہور، فکشن ہاؤس ۲۰۰۲ء۔
۲۸۔ گمی، سلیم خان: ''کشمیر ادب و ثقافت''، لاہور، یونیورسل بکس، سنہ ندارد۔
۲۹۔ محمود شیرانی، حافظ: ''پنجاب میں اُردو''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء۔
۳۰۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقاء''، لاہور، مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۹۷ء۔
۳۱۔ منظوم علی، پروفیسر: (مرتب) ''قراقرم ہندوکش'' اسلام آباد، برق سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۵ء۔
۳۲۔ ہارون الرشید: ''بوندیں''، راولپنڈی، ایس، ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۱ء۔
۳۳۔ سلمان ندوی، سید: ''نقوش سلیمانی''، لاہور، ادبی مرکز، ۱۹۶۷ء۔
۳۴۔ ہاشمی، حمید اللہ: ''پنجابی زبان و ادب''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۸ء۔
۳۵۔ یوسف حسین آبادی، 'بلتستان پر ایک نظر''، اسکردو، شبیر آفسٹ پرنٹرز، ۱۹۸۴ء۔
۳۶۔ یوسف حسین آبادی: ''تاریخ بلتستان'' اسکردو، بک ڈپو، ۲۰۰۳ء۔

ب:
۱۔ ''بلتی قاعدہ''، (مرتب) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء۔
۲۔ ''پاکستانی ادبیات''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء۔
۳۔ ''پاکستانی زبانیں''، (مرتب) شعبۂ پاکستانی زبانیں، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء۔

ج۔ رسائل:
۱۔ ''اخبار اُردو''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۲۔ ''ادبیات'' (سہ ماہی)، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان۔
۳۔ ''پیغام آشنا''، اسلام آباد، ثقافتی کونسلیٹ ایران۔
۴۔ ''کارواں'' (شمارہ نمبر ۱ تا ۳) خپلو، کاروان ادب سنہ ندارد۔

د۔ دستاویزات:
۱۔ ''فقہ الاحوط''، سید محمد نور بخش، (قلمی نسخہ)۔
۲۔ گریرسن، لنگوسٹک سروے آف انڈیا۔
۳۔ ''مردم شماری رپورٹ''، برائے سال ۱۸۹۱ء (غیر مطبوعہ) مملکو کہ محکمہ ریونیو۔ شمالی علاقہ جات۔